سہ ماہی

الاقرباً

اسلام آباد

الاقرباء فاؤنڈیشن اسلام آباد

سہ ماہی **الاقرباء** اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۷ شمارہ نمبر ۲ اپریل۔جون ۲۰۰۴ء

الاقرباء فاؤنڈیشن۔اسلام آباد

مکان نمبر ۴۶۴ سٹریٹ نمبر ۵۸ آئی ۸/۳ اسلام آباد

فون ۴۴۴۲۶۸۶

E-mail:alaqrebaislamabad@hotmail.com

alaqrebaislamabad@yahoo.com

سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد

شمارہ	اپریل۔جون ۲۰۰۴ء
ناشر	سید ناصر الدین
کمپوزنگ	نعیم کمپوزرز۔اسلام آباد
طابع	ضیاء پرنٹرز۔اسلام آباد

زرِتعاون

فی شمارہ	۵۰روپے
سالانہ	۲۵۰روپے
بیرون ملک فی شمارہ	۵ڈالر/۳ پاؤنڈ
بیرون ملک سالانہ	۲۰ڈالر/۱۲ پاؤنڈ

مندرجات

افسانہ

حمد ونعت

سلام ومنقبت

رباعیات وقطعات

غزلیات

نقد و نظر

مراسلات

خبر نامہ الاقرباء فاؤنڈیشن

اداریہ

بین المملکتی ادب

ہر چند کہ ادب جغرافیائی حدود کا پابند نہیں ہوتا لیکن یہ بھی ممکن نہیں کہ مقامی حالات و واقعات سے ماورا اپنے بنیادی خدوخال مرتب کر سکے البتہ عالمگیریت یا آفاقیت کے عوامل ادب کو صرف اسی وقت اپنی گرفت میں لیتے ہیں جب ادب تخلیق کرنے والے اذہان انسانیت کو ایک ناقابل تقسیم وحدت کی حیثیت سے اپنا موضوع فکر بنائیں ایسی صورت میں جغرافیہ اپنی شناخت تو ضرور برقرار رکھتا ہے لیکن حیاتِ انسانی کے وسیع ترکینوس میں تحلیل ہو کر اُن اقدار کے تابع ہو جاتا ہے جو رنگ و نسل کے امتیازات کو پس پشت ڈال کر صرف اور صرف عالم انسانیت کی ترجمانی اور حیاتِ انسانی کی عکاسی پر قادر ہوں۔

اِس سال مارچ میں پاکستان کو سارک ممالک کے ادیبوں اور اہل قلم کی ایک توجہ طلب کانفرنس کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ سارک میں یعنی جنوبی ایشیا کی علاقائی تعاون کی تنظیم میں پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، مالدیپ، نیپال اور بھوٹان شامل ہیں۔ یہ ممالک مربوط شکل میں جنوبی ایشیا کا ایک ایسا نقشہ مرتب کرتے ہیں جس پر تاریخی و جغرافیائی، تہذیبی و معاشرتی اور لسانی و ادبی مماثلتوں اور یکسانیتوں کے منتشر نقوش اس خطہء ارضی کے پس منظر و پیش منظر کو رنگارنگی میں یک رنگی (Unity in diversity) عطا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نوع کے سیاق و سباق کی تشکیل سے ایک ایسا ادب وجود میں آسکتا ہے جسے اس خطّہ کے حوالے سے بین المملکتی ادب کہا جا سکے، اہل قلم اُن واشگاف و برملا حقیقتوں کو اپنے افکار کا موضوع بنا سکتے ہیں جو تمام خطہ میں اقدارِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہوں چنانچہ کانفرنس میں اس امر پر کامل اتفاق پایا گیا کہ غربت و جہالت کے یکساں اثرات نے سارک ممالک کے عوام کی زندگیوں کو ایک کربِ مسلسل سے دوچار کر رکھا ہے اور یہ اذیت ناک عمل انسانی صلاحیتوں کو نہ صرف ابھرنے سے پہلے ہی نیست و نابود کر دیتا ہے بلکہ معاشرہ کے تہذیبی و تمدنی مزاج اور معاشی و معاشرتی توازن پر سفاک منفی رجحانات بھی

مرتب کرتا ہے۔ ہر چند کہ ادب خواہ وہ افسانہ وناول کی شکل میں ہو یا نظم وغزل کی متنوع اصناف کی صورت میں ماحول میں ایک فکری ارتعاش یقیناً پیدا کر سکتا ہے لیکن وہ انقلاب جو انسانی حقوق کے احترام کی نوید لیکر معرض وجود میں آئے یا جو دولت کی ناواجب تقسیم کے بے رحمانہ نظام پر کاری ضرب لگائے' شاید اُس برق رفتاری سے برپا نہ ہو سکے جس کی اشد ضرورت ہے کہ مزاحم قوتیں اپنی جڑیں اتنی مضبوط بنا چکی ہیں کہ انہیں اکھاڑ پھینکنے کے لئے جدید ترین مادی وسائل کی ایک قوت لایموت درکار ہوگی۔

اندریں حالات قلم کا استعمال انتہائی حزم واحتیاط کا متقاضی ہے اور فنکارانہ غور وفکر کے ساتھ ساتھ مدبرانہ حکمت عملی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ ایسے حالات میں غیر متوازن تحریریں طبقاتی تقسیم اور باہمی منافرت کے منظر نامہ پر منتج ہوتی ہیں جن سے انسانی وحدت وعظمت کا پامال ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے جو ہر تعصب سے آزاد کسی بھی اہل قلم کا مدعا نہیں ہو سکتا چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے سارک ممالک کے اہل قلم کے درمیان انفرادی اور اجتماعی روابط کا فروغ ازبس ضروری ہے جس کے لئے ہر ملک میں جہاں مناسب وقفوں سے سیمینار اور کانفرنسوں کا انعقاد مددگار ثابت ہو سکتا ہے وہاں متعلقہ حکومتیں اہل قلم کو سفر وقیام کی ایسی سہولتیں مہیا کر سکتی ہیں جس کے نتیجہ میں اہل قلم کی بین المملکتی نقل وحرکت میں اضافہ ایک دوسرے سے فکری اور جذباتی قرابتیں پیدا کرنے اور تہذیبی وثقافتی رویوں میں ہم آہنگی کی فضا کو فروغ دینے میں مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب تک سارک تنظیم کا کوئی بھی باوسیلہ وبااثر رکن اہل قلم کو سیاسی ترغیبات سے اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش نہ کرے اور ایسا نہ ہو کہ ایک ملک کی مخصوص تہذیب وثقافت اور تمدن ومعاشرت کو اہل قلم کے استحصال کے ذریعہ سارک ممالک کے چپہ چپہ پر مسلط کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہمارے ان خدشات کو بدقسمتی سے جو بنیاد فراہم ہوتی ہے وہ خود ہمارے درمیان ایسے "مضمحل الضمیر" اشخاص کی موجودگی کے باعث ہے جو ایک غیر ملکی مشاعرہ یا کسی نام نہاد بین الاقوامی کانفرنس کا دعوت نامہ حاصل کرنے کے لیے اپنا ہی نہیں بلکہ اپنی قوم کا وقار بھی داؤ پر لگا

دیتے ہیں اور ایک مخالف نظریہ کے حامل سامعین کی خوشنودی کے لئے اپنے ہی بنیادی اقدار و
نظائر کو ہدف تنقید بناتے ہیں یہ لوگ پیشہ ور قلم فروش ہیں اور جن کا منتہائے مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ
ایسے مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی رُطب و یابس تخلیقات کے غیر ملکی زبانوں میں تراجم اور
اپنے ''اعزاز'' میں تقاریب کا بہر قیمت بندوبست کر کے اپنی ''کلاہِ دانش'' میں ایسے سرخاب کے
پر سجا کر واپس لوٹیں کہ اہل وطن انہیں عظیم شاعر اور بین الاقوامی ادبی شخصیت سمجھنے پر مجبور ہو جائیں
ہمیں افسوس ہے کہ لاہور میں منعقد ہونے والی سارک ادبی کانفرنس بھی اگر تمام نہیں تو بعض ایسے
افراد کے شوقِ فضول کی نذر ہو کر رہ گئی جو صرف ذاتی مفادات کے تحت متحرک و سرگرداں رہے اور
یرغمالی کانفرنس کوئی ایسا جامع چارٹر دینے سے قاصر رہی جو مستقبل کے لئے ایک حقیقی بین المملکتی
لائحہ عمل کا نقیب بن سکتا بہر حال یہ بھی کیا کم ہے کہ:

نشستند و گفتند و برخاستند

سید مرتضٰی موسوی

فارسی شعر و ادب میں برصغیر کے اہل قلم کا حصّہ

برصغیر میں اسلام کی نشر و اشاعت کے تین نمایاں عوامل میں پہلا محمد بن قاسم کی قیادت میں سندھ پر مسلمانوں کی تادیبی لشکر کشی (۹۲ھ) اور بعد کے ادوار میں وسطی ایشیاء، موجودہ افغانستان اور ایران کی سرزمینوں پر تصرّف رکھنے والے مسلمان حکمرانوں کی مہمات، دوسرا مسلمان تاجروں کے ذریعہ جو برصغیر کے ساحلی شہروں میں رفت و آمد کرتے اور تیسرا عامل عارفوں، صوفیوں اور اولیاء کے طفیل جن میں سے اکثر اہلِ شعر و سخن بھی تھے اور اُن کی ولادت بعض صورتوں میں برّصغیر سے باہر ہوئی تھی جیسے شیخ اسماعیل بخاریؒ موجودہ ازبکستان میں، سیّد علی ہجویریؒ، شاہ یوسف گردیزیؒ اور مسعود بختیار کاکیؒ (متوفی ۹۲۵ھ) افغانستان میں حسین زنجانیؒ، شیخ جلال الدین تبریزیؒ، سید جلال الدین بخاریؒ (م ۶۹۰ھ) سید علی ہمدانیؒ (م ۷۸۶ھ) شاہ شمس سبزواریؒ (م ۶۲۲ھ) اور عثمان مروندیؒ (لعل شہباز قلندر) ایران میں تولد ہوئے۔ اِن کے علاوہ برّصغیر میں مختلف ادوار میں سرچشمہ ہائے فیوضات شخصیتوں میں معین الدین چشتی اجمیریؒ (م ۶۳۳ھ) شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ (م ۶۶۱ھ) شاہ رکن عالمؒ (۸۳۵ھ) حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نظام الدین اولیاؒ (۷۲۵ھ) سید محمد گیسودرازؒ (۸۲۵ھ) اور دیگر مشائخ جنہوں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جیسا کہ ہمارے علم میں ہے، فارسی زبان کا برصغیر میں ورود مسلمانوں کے ساتھ ہی عمل میں آیا۔ چنانچہ اس سرزمین میں فارسی کی موجودگی کو نہایت محتاط اندازے کے مطابق گیارہ صدیوں پر محیط سمجھا جاتا ہے۔ اگر اس بات کو ایک اور انداز سے دیکھا جائے تو ہم متوجہ ہوں گے کہ موجودہ فارسی کا احیاء بعد از اسلام دور کے ایران میں سلاطین طاہری (۲۵۹-۲۰۵ھ) و سلاطین صفاری (۲۹۰-۲۴۵ھ) جن کے قلمرو میں مکران اور سندھ بھی شامل تھے کے عہد سلطنت میں ہوا۔ فارسی شاعری کے ابتدائی نمونے یعقوب بن لیث صفاری (۲۶۵-۲۵۲ھ) کے زمانے سے منسوب ہیں۔ تیسرا حکمران خاندان جو مذکورہ دو خانوادوں کا جانشین ہوا سامانی سلاطین (۳۸۹-۲۶۱ھ) سے عبارت ہے اور اسی دور میں فارسی شاعری کی تاریخ میں پہلی شاعرہ رابعہ بنت کعب قزداری جو فارسی کے پہلے ممتاز شاعر رودکی ثمرقندی کی ہم عصر اور پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں رہتی تھی، نے تغزل سے

بھرپور شاعری کی۔ گیارہ سو سال پہلے کی اس فکری کاوش میں لغات وتراکیب تقریباً وہی ہیں جو ہم آج بھی اسی طرح استعمال کرتے ہیں لیکن مضامین میں ندرت کی مثال نہیں ملتی۔ دو مختلف غزلوں سے ایک ایک شعر ملاحظہ کیجئے:

دعوتِ من برتو آن شد کایزدت عاشق کناد! بریکی سنگین دلی نامہربان چون خویشتن!

مگر چشم مجنون بہ اَبر اندر است؟ کہ گل رنگ رُخسار لیلی گرفت

غزنوی سلاطین کے عہد میں تصوف پر مبنی پہلی نثری تصنیف ''کشف المحجوب'' علی بن عثمان ہجویری داتا گنج بخشؒ (م ۴۸۱ھ کے بعد) نے لاہور میں لکھی۔ اسی دور میں نکتی لاہوری، ابوالفرج رُونی اور مسعود سعد سلمان (م ۵۱۵ھ) نے موجودہ لاہور اور اس کے نواح میں شعروسخن میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ ابوالفرج رُونی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ برصغیر کا پہلا صاحب دیوان شاعر گردانا جاتا ہے اور ایران میں مسعود سعد سلمان کا دیوان تقریباً نصف صدی بعد شائع ہوا اور ابوالفرج رُونی کا دیوان آج سے ۸۷ سال قبل پروفیسر چایکین رُوسی جو اُس دور میں اپنے ملک کے سفارتخانے میں مترجم تھے اور بعد میں روس میں فارسی کی تدریس میں اہم خدمات انجام دیں کی تصحیح کے ساتھ (۱۳۰۴ھ) شمسی میں تہران میں شائع ہوا۔ مسعود سعد سلمان کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتا ہے کہ فارسی میں حبسیہ شاعری میں وہ مبتکر کا درجہ رکھتا ہے۔

نہ نہ زحصن نای بیفزود جاہِ من دانَد جہان کہ مادر ملکست حصن نای

امروز پست گشت مراہمت بلند زنگار غم گرفت مراطبع غم زادی

کاری ترست بردل وجانم بلا وغم ازرنج آب دادہ وازتیغ سرگرای

اس جگہ ابوریحان البیرونی کی تصنیف ''تحقیق ماء الھند'' جو اسی دور میں لکھی گئی کا تذکرہ ضروری ہے جو اسلامی سرزمینوں میں برصغیر کے بارے میں معلومات کا بیحد اہم ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بعد کی صدیوں میں، عالموں، عارفوں اور دانشمندوں کی کثیر تعداد ماوراء النھر، وسطی ایشیاء، خراسان اور سیستان سے برصغیر منتقل ہوئی۔ غوری حکمرانوں (۶۰۲-۵۸۲ھ) کے زوال کے بعد پانچ حکمران خاندانوں نے لاہور اور دہلی سے برصغیر کے وسیع علاقوں پر حکومت کی اور ایک دوسرے کے جانشین ہوئے ان میں غلامان (۶۸۶-۶۰۲ھ)، تغلق (۸۱۷-۷۲۰ھ) خلجی (۷۲۰-۶۸۹ھ) سادات (۸۵۵-۸۱۷ھ) اور لودھی (۹۳۲-۸۵۵ھ) شامل ہیں۔ تاریخ میں ان پانچ حکمران خاندانوں کے دور کو ''سلاطین دہلی کے عہد'' سے

یاد کیا جاتا ہے جن کی حکومت ۳۳۴ سال تک برقرار رہی۔ فارسی زبان کے صدہا مصنفین اور شعراء میں جو اس دور میں ہوئے نمایاں ترین ابو الحسن امیر خسروؒ (م ۷۲۵ ھ) امیر حسن سجزیؒ (م ۷۳۷ ھ) چراغ دھلویؒ (م ۷۵۷ ھ) شیخ جمالیؒ، نظام الدین اولیاءؒ (م ۷۲۵ ھ) شیخ زکریا ملتانیؒ (م ۶۶۴ ھ) اور شاہ جلالؒ ہیں جن کا مزار موجودہ بنگلہ دیش کے شہر سلہٹ میں مرجع خلائق ہے۔

سلاطین دہلی کے دور میں سب سے ممتاز فارسی زبان کے اہل قلم امیر خسروؒ ہیں جن کی جامع الصفات شخصیت کے چند پہلوؤں میں پانچ مختلف بادشاہوں کے عہد میں ملک الشعرائی کا منصب، فوجی سردار، مشیر، نثر نویس، ماہر موسیقی اور عارف عامل ہونا شامل ہیں۔ نثری تصانیف میں رسائل اعجاز پانچ جلدوں میں جنہیں اسم با مسمّٰی کہا جاسکتا ہے۔ تاریخ علائی اور افضل الفوائد (ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاءؒ) کا ذکر مناسب ہے جبکہ شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں درجنوں تصانیف منجملہ پانچ دیوان جن کے نام تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرّۃ الکمال، بقیہ نقیہ اور نھایۃ الکمال ہیں۔ تاریخی، ادبی اور عرفانی مثنویوں میں تغلق نامہ، مفتاح الفتوح، نُہ سپہر، قران السعدین اور عشقیہ، نظامی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے خمسہ پنج گنج کی مثنویاں جن میں مطلع الانور، شیرین وخسرو، لیلیٰ ومجنوں، آئینہ اسکندری اور ہشت بہشت شامل ہیں۔ امیر خسروؒ نے اپنے عہد کی تاریخ کو نہ فقط منظوم شکل میں محفوظ کیا بلکہ حکمت، اخلاق اور عرفان کے عمدہ نکات بیان کئے ہیں۔

بازکسی راکہ خسندرہ زند	زخمہ درین رہ نہ یکی دہ زند
گر بہ مثل صد ھنر آرم زغیب	ہیچ نگاہی نکند جز بہ عیب
صد سخن راست نگیرد بہ ہیچ	یک رقم کثر کند انگشت پیچ

ساتویں صدی ہجری برصغیر کی متصوفانہ تاریخ میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس دور میں لعل شہباز قلندرؒ (۶۲۲ ھ) خواجہ معین الدین چشتیؒ (م ۶۳۳ ھ) قطب الدین بختیار کاکیؒ (م ۶۳۴ ھ) شیخ جلال الدین تبریزیؒ (م ۶۵۴ ھ) سید جلال الدین بخاریؒ (م ۶۹۰ ھ) فرید الدین گنج شکرؒ (م ۶۷۰ ھ) اور بیسیوں دیگر عارف برصغیر کے طول وعرض میں نہ فقط اسلام کی ترویج واشاعت کا باعث بنے بلکہ فارسی ادب اور شاعری میں شاہکار اضافے کئے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کی یہ رُباعی زبان زد وخاص وعام ہے۔

شاہ ہست حسینؓ بادشاہ ہست حسینؓ دین ہست حسینؓ، دین پناہ ہست حسینؓ

سرداد نداد دست دردست یزید حقا کہ بنائے لا الہ ہست حسینؓ

خواجہ اجمیریؒ نے داتا گنج بخش" کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ کم نظیر ہونے کے ساتھ لوحہء آرامگاہ پر درج ہے۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا ناقصان را پیر کامل کاملان رہنما

خواجہ چشت کا تغزل بھی مضمون آفرینی اور سوز و گداز سے مملو ہے:

آن درد کہ من دارم، باکس نتواں گفتن درد دل دریارا باخس نتواں گفتن

برصغیر کو فارسی ادب میں ایک امتیاز ساتویں صدی ہجری ہی میں یہ میسر آیا کہ فارسی تاریخ تذکرہ نگاری میں لکھا جانے والا پہلا تذکرہ "لباب الالباب سدیدالدین محمد عوفی نے اُوچ شریف (بہاولپور ڈویژن) کے قیام کے دوران لکھا جس میں عوفی نے آغاز سے اپنے دور تک کے فارسی شعراء کے احوال اور آثار کے نمونے درج کیے ہیں بطور مثال رابعہ بنت کعب قزداری کی زندگی اور شاعری کا قدیم ترین ماخذ تذکرہ لباب الالباب ہی ہے۔

ساتویں صدی ہجری کے نصف دوم اور آٹھویں صدی ہجری کے نصف اول کی نمایاں ترین ادبی شخصیت امیر خسروؒ کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ انہی کے ہم عصر امیر حسن سجزی کو اپنے تغزل کی رفعت کی بناء پر بعض محققوں نے "سعدی ہند" کے طور پر ملقب کیا ہے۔ امیر حسن اولیاء کے ملفوظات پر مبنی ہے، صدیوں سے مورد استفادہ ہے۔

تذکرہ "سیر العارفین" کے مصنف شیخ جمالی عہد سلاطین کے اواخر اور مغلیہ دور کے شروع میں شعر و نثر دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔ دیوان اشعار کے علاوہ مثنوی مہر و ماہ، مثنوی مراۃ العالی، مفتاح الاسرار اور شرح لمعات جمالی کے آثار میں نمایاں ہیں۔ شیخ جمالی کو برصغیر کے فارسی ادبا اور شعراء میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے مشرق وسطیٰ اور ایشیائے صغیر میں متعدد سفر کیے۔ منجملہ تشرّف بہ حرمین شریفین و بیت المقدس ہرات، خراسان، مازندران، گیلاں، آذربائیجان، عراق اور شام کے علاوہ روم واندلس کے سفر بھی کیے اسی جہانگردی نے جمالی کے فکر و نظر کو جو گیرائی اور گہرائی بخشی وہ اس کی شاعری میں جھلکتی ہے۔ نمونۃً دو شعر ملاحظہ ہوں:

مَر درا کردار عالی قدر گرداند نہ نام　　ہر کسی کورا علی نام است نی چون حیدر است

از معانی افتخار سینہ عالم بود　　عزت معدن نہ از کوہ است بل کز گوہر است

برصغیر کے مغلیہ حکمرانوں کا دور (۳-۱۲۷۳-۹۳۲ھج ' ۱۸۵۷-۱۵۲۶ء) فارسی زبان اور ادب کی نشر و اشاعت میں کئی جہتوں سے ممتاز مقام رکھتا ہے۔ سینکڑوں ادیب اور شاعروں نے اغلب حکمرانوں اور امراء کی سرپرستی میں نثر و نظم میں تواریخ، تذکرے، دواوین، مثنویاں اور دیگر اصناف سخن میں تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے صرف ممتاز ترین شخصیتوں کا ذکر مقصود ہے۔

بابر ہمایوں اور اکبر کے ادوار میں غیاث الدین خواند میر مولّف تاریخ حبیب السّیر، غزالی مشہدی (م ۹۸۰ھ) عرفی شیرازی (م ۹۹۹ھ) ابوالفیض فیضی (م ۱۰۰۴ھ) نظیری نیشاپوری، ابوالفضل علامی مولّف اکبر نامہ اور آئین اکبری، ملاّ عبدالقادر بدایونی صاحب منتخب التواریخ، عبدالرحیم خان خاناں، شیخ احمد سرہندیؒ، نظام الدین صاحب طبقات اکبری اور شیخ عبدالحق محدّث دھلویؒ (م ۱۰۵۲ھ) نہایت نمایاں ہیں۔

جہانگیر، شاہجہان، اور اورنگزیب کے ہمعصر فارسی نویس ادیبوں اور شاعروں میں قاضی نور اللہ شوشتری صاحب مجالس المومنین، ملک قمی (م ۱۰۲۵ھ) ظہوری ترشیزی (م ۱۰۲۵ھ) طالب آملی (م ۱۰۳۶ھ) قدسی مشہدی (م ۱۰۵۴ھ) منیر لاہوری (م ۱۰۵۵ھ) سلیم تھرانی (م ۱۰۵۷ھ) ابوطالب کلیم ہمدانی (م ۱۰۹۱ھ) محمد داراشکوہ (م ۱۰۶۹ھ) غنی کشمیری (م ۱۰۸۹ھ) صائب تبریزی (م ۱۰۸۱ھ) غنیمت لاہوری (م ۱۱۰۰ھ) نعمت خان عالی شیرازی (م ۱۱۲۱ھ) کامگار مرزا مولّف تاریخ جہانگیری، انجوی شیرازی مولّف فرہنگ جہانگیری، عبدالقادر بیدل عظیم آبادی (م ۱۱۳۴ھ) حزین لاھیجانی (م ۱۱۸۱ھ) ناصر علی سرہندی، زیب النساء مخفی کے منشور و منظوم آثار برصغیر کے فارسی ادب اور شاعری کے غنی کرنے میں موثر رہے۔ مغلیہ سلطنت کا نصف دوم اورنگ زیب کی وفات سے شروع ہو کر بہادر شاہ ظفر کی معزولی اور جلاوطنی تک کے دور پر محیط ہے۔ اس دور میں سیاسی عدم استحکام اور ایران اور برصغیر کے درمیان اہل قلم اور دانشوروں کی نقل و حرکت میں نمایاں کمی کے باعث فارسی زبان و ادب کی ترویج اور کیفیت و کمیت متاثر ہوئی لیکن اس کے باوجود بیسیوں مصنفین اہل قلم اور سخنوروں نے فارسی نویسی اور فارسی گوئی کی روایات کو جاری رکھا۔ اس دور میں شمالی برصغیر کے علاوہ دکن کی مسلمان سابق ریاستوں احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ میں بھی فارسی شعر و ادب وجود میں آتا رہا۔ مجموعی طور پر محمد امین میر روح الامین جو صاحب دیوان ہونے کے ساتھ کئی مثنویوں کا سرایندہ ہے نظام الدین

شیرازی مولف تاریخ قطب شاہی، اسداللہ خان غالب (م ۱۸۶۹ھ) سراج الدین علی خان آرزو (۱۱۶۹ھ) محمد حسین قتیل اس دور میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد برطانوی راج میں برصغیر میں فارسی زبان کی سرکاری حیثیت کو ختم کر دیا گیا اور نظام تعلیم میں دینی مدارس کے علاوہ فارسی کی تدریس محدود کر دی گئی لیکن اس عرصے میں ذولسانین شعرا کی ایک متعدبہ تعداد اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ فارسی شعر وادب کا ہزار سالہ ذوق برصغیر کے لوگوں بخصوص مسلمانوں میں برقرار رہا۔ اٹھارویں صدی کے بعد گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں فارسی شاعری کے نمایاں نام عظامی جالندھری، محمد شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) الطاف حسین حالی (م ۱۹۱۴ء) گرامی جالندھری (م ۱۹۲۷ء) ادیب پشاوری (م ۱۹۳۰ء) علامہ محمد اقبالؒ (م ۱۹۳۸ء) زیب مگسی (م ۱۹۵۳ء) مولانا ظفر علی خانؒ (م ۱۹۵۶ء) اور ادیب فیروز شاہی (م ۱۹۷۳ء) ہیں لیکن جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں برصغیر میں اس عہد کا ممتاز ترین فارسی گو فلسفی شاعر اقبال ہے جن کے بارے میں ایران کے دور حاضر کے ممتاز ترین شاعر محمد تقی بھار ملک الشعراء (م ۱۹۵۱ء) نے کہا ہے۔

دور حاضر خاصہ اقبال گشت   واحدی کز صد ہزاران سرگذشت

اقبال کے بعد برصغیر میں فارسی گوئی کو ایک گونہ تقویت ملی۔ اُن کی زندگی میں اور بعد میں جن بیسیوں شاعروں نے فارسی میں آثار چھوڑے ہیں ان میں رعنای کاظمی (م ۱۹۳۱ء) فیروز طغرائی (م ۱۹۳۱ء) قاسم یاسینی (م ۱۹۳۱ء) یوسف عزیز مگسی (م ۱۹۳۵ء) ابوبکر مستونگی (م ۱۹۳۷ء) داؤد خان اختر شیرانی (م ۱۹۴۸ھ) ڈاکٹر محمد دین تاثیر (م ۱۹۵۰ء) اصغر علی روحی لاہوری (م ۱۹۵۴ء) رضا علی وحشت کلکتوی (م ۱۹۵۶ء) سردار عبدالرب نشتر (م ۱۹۵۸ء) اسد ملتانی (م ۱۹۵۹ء) عبدالمجید سالک (م ۱۹۵۹ء) مرتضیٰ احمد خان میکش (م ۱۹۵۹ھ) مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری (م ۱۹۶۲ھ) ہادی مچھلی شہری (م ۱۹۶۳ء) علامہ عنایت اللہ مشرقی (م ۱۹۶۳ء) ناظم سندھی (م ۱۹۶۴ء) عنایت علی شاہ ضیاء جعفری (م ۱۹۷۰ء) لعل شاہ جگر کاظمی (م ۱۹۷۲ء) حفیظ ہوشیار پوری (م ۱۹۷۳ء) محمد حسین عرشی امرتسری، پروفیسر محی الدین خلوف، عطاء اللہ خان عطا (م ۱۹۹۱ء) تبسم قرشی (م ۱۹۷۳ء) صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، شبیر حسن خان، جوش ملیح آبادی (م ۱۹۸۲ء) آغا حسین ارسطو جاھی، رئیس امروھوی، انور فیروز پوری، ماہر القادری (م ۱۹۷۱ء) ممتاز حسن احسن، ذہین تاجی، ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی نمایاں ہیں۔

ہم برصغیر کی فارسی نثر و نظم کے حجم اور کمیت کا جب جائزہ لیتے ہیں تو بہت محتاط اندازے کے مطابق

تذکرہ نگاری، تاریخ نگاری، لغت نویسی، قران وحدیث، وعلوم دینی کے فارسی تراجم وتفاسیر دیگر موضوعات پر فارسی میں لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد گزشتہ گیارہ سو سال میں خود ایران میں لکھی جانے والی نثر و نظم سے اگر زیادہ نہ ہو تو کسی صورت کم بھی نہیں جہاں تک فارسی ادب کی تخلیق کا تعلق ہے، باوجود اس کے کہ ایران کی طرح یہاں بھی فردوسی، سعدی، رومی، اور حافظ جیسے استادان سخن کے کلام پر لوگ بیشتر گرویدہ اور فریفتہ تھے لیکن برصغیر میں اتنی زیادہ فارسی شاعری کا رواج رہا کہ فارسی شاعری کے تین بڑے طرز سخن واسلوب میں سے ایک برصغیر (سبک ہندی) سے منسوب ہے۔ فارسی زبان کی علمی، ادبی، تمدنی اور ثقافتی اہمیت کے پیش نظر ہمارے نظام تعلیم کی مختلف سطحوں میں اس کی تدریس کی گنجائش نکالنے کی ضرورت ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترویج و اشاعت اقتضائے وقت ہے لیکن ثقافتی ورثے اور انسانی اقدار کی ترویج افراد و معاشرے کی تربیت کیلئے ایک لازمی اور ابدی ضرورت ہے۔

کتابیات

۱۔ احمد، ڈاکٹر ظہور الدین، آغاز و ارتقائی، زبان فارسی، در شبہ قارہ، (فارسی) اسلام آباد، ۲۰۰۰ء

۲۔ احمد، ڈاکٹر ظہور الدین، پاکستان میں فارسی ادب (اردو) یونیورسٹی بک ایجنسی، لاہور (بی تا)

۳۔ رضوی، ڈاکٹر سید سبطین حسن، فارسی گویان پاکستان (فارسی) اسلام آباد، ۱۹۷۴ء

۴۔ موسوی، سید مرتضی، بمدیریت، فارسی، رسائل کے مختلف شمارے

الف: سہ ماہی ''پاکستان'' تہران، ۱۹۶۶۔۱۹۷۰ء

ب: ماہنامہ ''ہلال'' کراچی، ۱۹۷۱۔۱۹۷۲ء

ج: ماہنامہ ''پاکستان مصور'' اسلام آباد، ۱۹۷۳۔۱۹۸۳ء

د: سہ ماہی ''دانش'' اسلام آباد، ۱۹۹۹۔۲۰۰۳ء

ڈاکٹر محمد معزالدین

اقبال کا ایک پسندیدہ شاعر ''پٹوفی''

شاید بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ پٹوفی ھنگری ادب میں ایک غیر فانی نام ہے۔ اس کی انقلاب پسندی، وطن دوستی اور جذبہ حریت سے متاثر ہو کر اقبال نے اس پر ایک چھوٹی سی نظم بعنوان ''پٹوفی'' لکھی ہے۔ علامہ اقبال نے عنوان کے نیچے یہ تعارفی الفاظ بھی لکھے ہیں۔

''شاعر جواں مرگ ھنگری کہ در معرکہ کارزار درحمایت وطن کشتہ
شد ونعش او نیا فتند۔ تا یاد گار خاکی ازاُو بماند'' پیام مشرق

(ھنگری کا جواں مرگ شاعر جو جنگ آزادی میں اپنے وطن عزیز کی حمایت کرتا ہوا مارا گیا
اس کی لاش کا بھی پتہ نہ ملا تا کہ اس کی کوئی یادگار باقی رہے۔)

اقبال کا کلام زندگی وعمل کا پیغام دیتا ہے اور پٹوفی سے وہ اس لئے متاثر ہیں کہ اس کی مختصر سی زندگی سراپا جہد وعمل تھی اس نے اپنی مختصر سی زندگی میں کبھی جابرانہ قوتوں کے آگے سر نہیں جھکایا۔ مصائب بیکراں سے دوچار ہوا فاقہ کشی کی زندگی گزاری مگر یہ شاعر انقلاب برابر ''رہ نوردِ شوق'' رہا اس نے کبھی منزل قبول نہ کی یہاں تک کہ وطن کی حفاظت کرتا ہوا جنگ میں کام آیا اور آج یہ بھی پتہ نہیں کہ یہ کہاں مدفون ہے نہ اس کا کوئی مزار بنا نہ کوئی نقش دوام باقی رہا مگر بقول علامہ اقبال ''بنوائے خودگم استی سخن تو مرقد تو''۔ یعنی تو اپنے کلام میں گم ہے اور تیری شاعری ہی تیرا مرقد ہے۔

پٹوفی کا پورا نام پٹوفی سینڈور Petofi sandor تھا یہ ایک نہایت بلند سیرت جوان تھا جس کے کردار کی پاکیزگی مثالی ہے اور اسی بلند کرداری نے اسے شاعرانہ عظمت کی راہ پر گامزن کیا۔ اس نے غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے کے لئے اپنے اندر بے پناہ ذوق یقین پیدا کر کے افلاس وناداری کی زندگی اور فاقہ کشی کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے لبیک کہا۔

یہ اس حد تک آزادی پسند تھا کہ اس نے اپنے باپ کی دربار سے حاصل کردہ جائداد کو بھی ٹھکرا دیا باپ، نے اس کی آزاد طبیعت سے بیزار ہو کر گھر سے نکال دیا اور یہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرا مگر دربار کی

خوشامدانہ زندگی سے دور رہا زندگی کے خطرات کا اس نے مردانہ وار مقابلہ کیا اور اس پر عمل پیرا رہا کہ "اگر خواہی حیات اندر خطر زی" زندگی کے آلام اور مصائب نے اس کی شاعرانہ جبلت کے لئے مہمیز کا کام کیا اس نے اس دور میں جو نظمیں لکھیں ان کا ایک ایک لفظ حریت پسندی اور آزادی کے جذبے سے مملو ہے۔ شروع میں اس کی انقلابی نظموں کو باغیانہ نظمیں سمجھا جاتا رہا اور کوئی ناشر تیار نہ تھا کہ اس کا کلام چھاپ کر حاکم وقت کے ظلم کا نشانہ بنے آخر میں ایک قدردان دوست Voros Marty ملا جس نے ان باغیانہ نظموں کو چھپوانے کا بندوبست کیا مگر اس پبلشر نے اس کی ناداری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے نہایت حقیر سی رقم اس کو دے دی جس نے اسے اور بھی دل شکستہ بنا دیا مگر اس دل شکستگی نے اس کے خیالات کو اور تیز کر دیا اور اس ٹوٹے ہوئے ساز سے جو نوائے آتشیں نکلی اس نے ہنگری کے سارے طول و عرض میں طوفان برپا کر دیا اور ہر طرف اس کے انقلاب بداماں اشعار گائے جانے لگے اس کی شہرت اتنی بڑھی کہ ایک نادیدہ قدردان پیدا ہوگئی جس کا نام جولیا زندرے Julia Szendrey تھا۔ پٹوفی سے بعد میں اس کے اتنے تعلقات بڑھے کہ وہ ۱۸۴۷ء میں اس کی رفیقہ حیات بن کر شریک سفر رہی۔

۱۸۴۴ء میں اس کا پہلا مجموعہ ورسک Versek کے نام سے چھپا تو اس کی عمر صرف اکیس سال تھی مگر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق اس کی ابتدائی شاعری اس کے مستقبل میں ایک عظیم المرتبت شاعر ہونے کی ضامن تھی چند ہی برسوں کے اندر اس نے اپنے کلام کے آٹھ نو مجموعے چھپوائے اور اب اس کی باغیانہ نظمیں تحریک آزادی اور انقلاب کا نقیب بن گئیں۔ اس نے عوام کے دلوں کو اس طرح گرمایا اور حب وطن کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا کہ ملوکیت کے آثار جنوں ختم ہو کر بربریت واستحصال کا چراغ ٹمٹمانے لگا اور اس کا نام ھنگری ادب میں انقلابی شاعر کی حیثیت سے زندہ جاوید ہوگیا۔

پروفیسر سلیم چشتی نے اس کی نظم کی تشریح کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ "اس کی نظموں میں ورڈزورتھ کی فطرت پرستی، بائرن کا تخیل، شیلے کی مستی، کیٹس کا تغزل اور ٹینی سن کا جوش یہ سب خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔"

علامہ اقبال کے نزدیک پٹوفی کی شاعری میں یہ تمام خوبیاں یکجا نہ بھی ہوں تب بھی اتنی بات تو ماننا ہی پڑے گی کہ وہ اس کی حریت پسندی اور انقلابی جذبے کی قدر کرتے ہوئے اس کی شاعرانہ عظمت کے اس حد تک معترف تھے کہ جہاں انہوں نے مارکس اور لینن کے ترقی پسند خیالات کی قدر کی ہے وہاں پٹوفی پر نظم لکھ

کر اس کو بلند مقام بخشتا ہے۔

تو بخونِ خویش بستی کفِ لالہ را نگارے
تو باہ صبح گاہے دل غنچہ را کشودی

(تو نے اپنے خون سے وطن عزیز کے چمن کی لالہ بندی کی ہے اور اپنی آہ صبح گاہی سے غنچوں کو پھول بنا دیا ہے یعنی قوم کے نوجوانوں کے دلوں میں گرمی کلام سے آزادی کی نئی روح پھونک دی ہے۔)

اس کے پہلے مجموعہ کلام کی اشاعت کے صرف چار سال بعد یعنی ۱۸۴۸ء میں جب ملک گیر انقلاب ابھرا تو یہ صاحب قلم صاحب سیف بن کر صرف آراء ہوا اور اس کی قوم نے اس کو رہنما بنا لیا۔

اس کی ایک نظم تالپرا مگیار Talpra Magyar جس کا مطلب ھنگری والے بیدار ہو جاؤ Rise Hungarians ہے اسی انقلاب کے موقع پر کہی گئی یہ نظم اس قدر مقبول ہوئی کہ ھنگری کا قومی ترانہ بن گئی۔

انقلاب کے وقت پٹوفی جنرل Jozsef Bem کے ساتھ مل کر کام کرتا رہا۔ جنرل اس کی شاعری کا بڑا مداح تھا اور اس کی بڑی قدر کرتا تھا۔

یہ ۱۸۴۹ء میں جنگ آزادی میں لڑتا ہوا سیگیور Segevar کی جنگ میں غالباً کام آیا عوام کا یہ اتنا محبوب شاعر تھا کہ عرصے تک لوگوں کا یقین نہیں آیا کہ وہ مارا گیا ہے اور عرصہ دراز تک اس کا بے چینی سے انتظار رہا۔

بقول علامہ اقبال درمعرکہ کارزار درحمایت وطن کشتہ شد" اس طرح ھنگری کے اس جواں مرگ شاعر نے اپنے کلام کی گرمی سے دلوں کی حرارت بڑھا کر اپنی شمع حیات گل کر لی۔ مگر اپنی قوم کو مستقل ایک مینارہ نور بخش دیا گو آج اس کی قبر کا نشان تک نہیں مگر ھنگری کے شعروادب کی دنیا کا یہ زندہ جاوید شاعر ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

علامہ اقبال کی پوری نظم گو تین اشعار پر مشتمل ہے مگر اقبال کے نزدیک پٹوفی کا کیا مقام تھا اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے یہ نظم اردو ترجمے کے ساتھ درج ذیل ہے۔

پٹوفی

نفسے دریں گلستاں زعروس گل سرودی　　بدلے غمے فزودی ز دلے غمے ربودی

(اس گلستان یعنی جہاں فانی میں اے شاعر: تو نے بہت تھوڑے عرصے تک نغمہ سرائی کی لیکن تو نے (اپنے کلام سے) غم دل کو بڑھا بھی دیا اور غم جانکسل کو دل سے دور بھی کر دیا یعنی جذبہ حب وطن کو بڑھا دیا اور

دنیاوی جاہ وحشم کے خیال کو دور کر دیا۔)

تو بہ خون خویش بستی کف لالہ را نگارے

تو بہ آہِ صبح گاہے دل غنچہ را کشودی

(تو نے اپنے خون جگر سے کف لالہ کی تذئین کی یعنی وطن کی زینت بڑھادی اور آہِ صبح گاہی سے کلی کو پھول بنادیا)

بنوائے خود گم استی سخن تو مرقد تو

بہ زمیں نہ باز رفتی کہ تو از زمیں نہ بودی

(تو اپنے کلام میں گم ہے اور تیری شاعری ہی تیرا مدفن ہے مرنے کے بعد تو زمین پر نہ لوٹا کیونکہ تیرا تعلق زمینی تھا ہی نہیں یعنی اس دنیا کو تو ہیچ سمجھتا تھا اس لئے مرنے کے بعد تو نے اس سے کوئی رشتہ نہ رکھا۔)

ہنگری زبان کی رسمی فرسودہ اور رومانی شاعری کی روایت سے ہٹ کر اس نے اپنی شاعری میں قومی امنگوں اور عوامی جذبات کو جگہ دی ہے ملک کے ثقافتی ورثے اور قومی ولولوں کے اظہار نے ان نظموں میں بلا کا زور پیدا کر دیا اور اس کی شاعری میں غضب کا جوش وخروش پیدا ہو گیا جس کے ذریعے وہ اپنی قوم کو بیدار کرنے اور طلسم گراں خوابی کو توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ جذبے میں اگر صداقت ہو اور اظہار و ابلاغ میں توانائی تو از دل خیزد بر دل ریزد کے مصداق بقول اقبال

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے　　　پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی شاعری براہ راست لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی ہے اور جادو جگاتی ہے اور یہی وہ راز ہے جس کے سبب پٹوفی کی نظمیں تحریک آزادی اور قومی امنگوں کی علمبردار بن گئیں اور آج اس کا شمار بلاشبہ دنیا کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے گو اس کی زبان کسی حد تک اس کی عالمگیر شہرت میں حائل رہی تاہم علامہ اقبال نے اس پر نظم لکھ کر جو اس کو خراج تحسین پیش کیا ہے وہ بجائے خود اس کی عظمت کی دلیل ہے۔

سید بدر حسین محشر زیدی

معمّا ...... علم بدیع کی ایک صنعت

دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو کی تشکیل میں بھی دوسری زبانوں کے نہ صرف الفاظ در آئے بلکہ ان کی دیگر خوبیوں نے بھی اس کی رنگ آمیزی میں حصہ لیا سب سے پہلا کام تو یہ ہوا کہ تقریباً پچاس حروف سے آراستہ اردو کی ابجد تین زبانوں یعنی بھاشا، فارسی اور عربی پر مشتمل وجود میں آئی جو ابتداء سے تا حال اسی طرح برتی جاتی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ تلفظ اور املا کی دشواریاں ختم ہوئیں۔ عربی میں چرخے کا املا اور فارسی میں بھائی نہیں لکھا جا سکتا جبکہ اردو کی ابجد دنیا کی پچانوے فیصد بولیوں اور زبانوں کے الفاظ کا درست املا لکھنے پر قادر ہے۔

جب فارسی سے اردو نے اصناف سُخن لئے تو ان کے جملہ لوازمات بھی منتقل ہوئے۔ حرف ندا کی مختلف صورتیں گفتگو کی زینت کا لباس بنیں۔ بعض محاورے اور ضرب الامثال جوں کے توں رائج ہوئے گویا ایک لسانی انقلاب آیا فارسی چونکہ مغل سلاطین کی درباری زبان تھی اس لئے اسے تحصیل کرنے کا خیال مقامی لوگوں کو بھی آیا اور اس خیال نے یہاں تک شہرت پائی کہ ہندوؤں کا ایک طبقہ جسے کائستھ کہا جاتا ہے فارسی کی تحصیل میں مسلمانوں سے بھی آگے نکل گیا اور پھر یہ ہوا کہ مغلیہ دربار سے چل کر امراء اور توابین تک انہیں منشی اور میر منشی کے مراتب تفویض ہونے لگے یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کے ادبی ذوق کی آبیاری میں بھی فارسی معاون ہوئی اور بہت سے نامی گرامی ہندو ادیب، شاعر اور نعت گو پیدا ہوئے۔ آج بھی بھارت کے مختلف علاقوں میں عمر رسیدہ کائستھ فارسی کے عالم پائے جاتے ہیں۔

اردو کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اسے ابتداء میں محققانہ اور مجتہدانہ ذہن میسر آگئے۔ اردو کی ابتدائی تعمیر کے دو نام رکھے گئے ''اردو اور ریختہ'' ریختہ[1] خصوصیت سے غزل کیلئے تھا تا کہ فارسی سے اس کا امتیاز نمایاں رکھا جا سکے۔ غالب نے کہا:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی ۔ گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

---

[1] ''پنجاب میں اردو'' از پروفیسر حافظ محمود شیرانی۔

یہ غلط فہمی بھی نقش کالحجر ہوگئی ہے کہ اردو لشکر کی زبان ہے۔ اگرچہ شاہجہاں نے عام دہلی کو بھی شاہجہاں آباد کے نام سے از سرنو آباد کیا تھا ایک حصے کو شاہی محل اور سرداروں کی بستی کہہ کر اس کا نام اردوئے معلّٰی رکھا تھا یہ الفاظ انیسویں صدی میں کثرت استعمال سے زبان اردوئے معلّٰی کے بجائے اردو رہ گیا۔ میر امّن دھلوی نے اپنی کتاب باغ و بہار عرف قصہ چہار درویش کے دیباچے میں یہی تصریح کی ہے اور اب جبکہ آپ یہ سُطور پڑھ رہے ہیں اردو ایک مستقل زبان کی حیثیت سے اقصائے عالم میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس کے اپنے حروف تہجی اور اپنے اصول وقواعد ہیں جبکہ دنیا میں اب بھی بہت سی زبانیں ایسی ہیں جو شکست و ریخت کی منزل سے گزر رہی ہیں اور اپنی ابجد تک سے محروم ہیں صرف ونحو کا توذکر کیا۔ طبائع کے اختلاف اور نئی چیز کو اپنانے کے شوق نے بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اصناف سخن میں فارسی کی تقلید نے نظم ونثر کے مختلف پیرائے عطا کئے اردو میں ان کے نمونے پر کام ہوا اور اس قدر ہوا کہ نثر کی جتنی مختلف ہیئتیں اردو میں نظر آتی ہیں فارسی میں نہیں ہیں۔ نظم بھی اپنی بوقلمونی کے اعتبار سے فارسی کے ہم پلہ ہے فن کی باریکیاں یعنی علم بیان، علم بدیع اور علم معانی پوری وسعت کے ساتھ اردو میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ ان کا وافر ذخیرہ شعراء اور ادبا کے کلام میں موجود ہے اردو کے وہ ستون جن پر اردو کی عمارت قائم ہے غالباً یہ چند افراد کہے جاتے ہیں یعنی مرزا مظہر جان جاناں، میر تقی میر، مرزا رفیع سودا، انشااللہ خان انشاء ذوق، غالب، سرسید، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی، مولانا حالی، محمد حسین آزاد، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور حکیم الامت علامہ اقبال۔

علم بدیع کی صنعت معمّا جو ہمارا موضوع ہے فارسی سے اردو میں آئی۔ یہاں بھی اہل فارس کی طرح اردو کے باکمالوں نے اسے حیات نو بخشی، لیکن آج کا دور اپنی تیز رفتاری کے سبب پیچھے مڑکر دیکھنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور ہمارا ادیب اور شاعر غم روزگار کے صدقے میں صرف شہر آشوب لکھنے پر مجبور ہے اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ فن کی موشگافیوں میں سر کھپائے ہمارے یہاں ادب کی باقیادت کو یاد رکھنا ویسے بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ بس یہ ایک خیال اس درازنفسی کا باعث ہوا کہ عہد جدید کے شائقین ادب کی ضیافت طبع کیلئے پرانی قدریں بھی نئی قدروں کے جلو میں رکھی جائیں تو مطالعہ دوآتشہ ہو جائے۔ قدماء کی کاوشوں کا جائزہ لینا ہمارا علمی فریضہ ہے۔ اردو کے محسنوں میں بڑا نام حضرت امیر خسرو کا بھی ہے۔

ذرا دیکھئے تو اردو میں دوسخنے: گوشت کیوں نہ کھایا ڈوم کیوں نہ گایا۔۔۔گلا نہ تھا

اردو اور فارسی میں دوسخنے: تشنہ راچہ می باید ملاپ کو کیا چاہیے۔ چاہ

کہہ مکرنی: اس بن دوجا اور نہ لوئے   وہ آئے تب شادی ہوئے

میٹھے لاگے واکے بول   اے سکھی ساجن؟ نا سکھی ڈھول

پہیلی:۔ بیسوں کا سر کاٹ لیا نہ مارا نہ خون کیا........ ناخن (پیروں اور دونوں ہاتھوں کے بیس ناخن)

صنائع لفظی میں یہ تین صنعتیں ذرا ذرا سے فرق سے آتی ہیں جو باہم مماثل معلوم ہوتی ہیں۔

اول :۔صنعت لغز جسے ہندی میں پہیلی اور فارسی میں چیستاں کہتے ہیں

دوم :۔صنعت مافی الضمیر یعنی دوسرے کے دل کی بات ظاہر کرنا یہ صنعت ضائع لفظی کے بیان میں مشکل ترین کہی جاتی ہے اور سر دست ہمارا موضوع نہیں ہے۔

سوم :۔صنعت معمّا: بحر الفصاحت کے مصنف نے حضرت امیر خسرو کے حوالے سے صنعت معمّا کا موجد بہار بخاری سمرقندی کو بتایا ہے۔ صنعت معمّا ضائع لفظی کے قبیلے سے ہے۔ جن لوگوں کو علم معانی پر دسترس ہو، الفاظ کی ماہیت سے کما حقہ، آگاہ ہوں اور الفاظ کے استعمال کا سلیقہ ہو وہ حروف والفاظ کے پردے میں کسی شے کا نام چھپا دیتے ہیں۔ قاری انہی حروف والفاظ کی مدد سے مدعائے اصلی معلوم کر لیتا ہے۔ چنانچہ صنعت معمّا کی تعریف کچھ یوں ہوگی۔ صنعت معمّا وہ ہے کہ شاعر یا ادیب کے کلام سے بہ اشارہ لفظ یا بہ دلیل حرف کوئی نام یا عبارت حاصل ہو۔ صنعت معمّا اور چیستاں (پہیلی) میں فرق یہ ہے کہ معمّا میں حل حروف والفاظ اسم میں مطلوب ہے اور چیستاں میں حل یا اصل مقصد اشیاء کی ذات اور اس کی تفصیل ہے۔

آج کا موضوع اس لئے زیر قلم ہے کہ ایک دن گھر کچھ احباب آئے۔ شعر پر گفتگو نے طول کھینچا اور بات صنعت معمّا تک آ گئی۔ مجھے اپنے زمانہ طالب علمی کا ایک شعر صنعت معمّا کا یاد آیا احباب اس کے حل سے قاصر رہے تا آنکہ میں نے انہیں سمجھایا بہت لطف اندوز ہوئے اسی دم یہ خیال آیا کہ اگر اسے تحریر میں لایا جائے تو شائقین ادب آج بھی اس سے حظ اٹھائیں گے۔ چنانچہ یہ سطور اسی ضمن میں صفحہ قرطاس پر نقش کر رہا ہوں اس صنعت کے سیاق وسباق کی اور تھوڑی سی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوئی۔ سو پہلے وہ بیان کرتا ہوں۔

معمّا کے حل سے اسم حاصل ہوتا ہے جس کی بہت سی صورتیں ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔ اول حروف اسم جو معمّا کا حل ہیں بہ ترتیب موجود ہوں مگر اسم کی حرکات کی طرف اشارہ بھی ہو۔ دوئم اسم مطلوب کی طرف اشارہ نہ ہو۔ سوئم یہ کہ حروف اسم معمّے میں مذکور ہوں اور بازیابی کا کوئی بھی اشارہ موجود نہ ہو، چہارم یہ کہ حرف اسم بھی مذکور نہ ہوں بلکہ کسی اور طرح سے ان کی طرف اشارہ ہو۔

الفاظ وحروف سے اسم کے حصول کی بھی کئی صورتیں ہیں ایک یہ کہ لفظ تین حال سے خالی نہ ہوگا۔
اگر مطلوبہ حرف کلمے کی ابتداء میں ہو تو اس کی تعبیر، مطلع، تاج، افسر، کلاہ، رخ یا پیشانی سے کریں گے جیسے نثر میں معمے کی مثال رجب علی بیگ سرور کی کتاب فسانہ عجائب سے دی گئی۔ شہزادی نے کہا طبیعت کی جودت اس شخص کی مشہور ہے ایک معما پوچھتی ہوں اگر بدیہہ جواب دیا تو شک بے شک رفع ہوا۔ بھلا وہ کیا چیز ہے جس کو گبرو مسلمان یہود اور عیسائی سب فرقہ انسان کا آشکارا کھاتا ہے مگر جب سر کاٹ ڈالو تو زہر ہو جائے کوئی نہ کھائے اور غصے میں کھائے تو فوراً مر جائے۔ جوان نے ہنس کر کہا! شہزادی وہ چیز قسم ہے حرف ق کو سر قرار دیا ہے۔
امیر اللہ تسلیم نے اس معمے کے مضمون کو شہزادی کے مضمون سے جدا کر کے شعر میں بیان کیا ہے

آتے آتے تازیاں پیدا کرے تاثیر سم ۔۔۔۔ گر عدو کھائے سرشہ کی کبھی جھوٹی قسم

اور غالب نے اس مضمون کو اپنے انداز سے بیان کیا ہے

کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں ۔۔۔۔ زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ

اگر مطلوبہ اشارہ درمیانی کلمے میں پوشیدہ ہو تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ مراد دل یا اندرون دل، مغز، مرکز توسط، کمر، موضع یا مقام ہے اور اگر مطلوبہ لفظ آخری کلمے میں موجود ہے تو لفظ قدم، دامن، خد، گہرائی، انجام، انتہا اور آخر سے اشارہ ہے سید انشاء نے جرأت کی ماں کے نام کا معما کہا تھا۔
''سر مونڈی، نگوڑی گجراتن'' (نگوڑی وہ عورت ہے جس کے پاؤں نہ ہوں) اس میں لطیفہ یہ تھا کہ جرأت کی مات کا نام گجراتن تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عربی لفظ بیان کر کے فارسی میں اس کے معنی لیتے ہیں اور کبھی فارسی لفظ بیان کر کے عربی معنی مراد ہوتے ہیں جیسے مومن کے اس معمے میں۔

کیوں کر نہ ہوں ملول میں شب کچھ نہیں رہی ۔۔۔۔ کیفیت وصال اب کچھ نہیں رہی

لفظ ملول میں سے شب کا نکالنا بیان کیا ہے کیونکہ شب فارسی ہے اس کا عربی بدل لیل ہے اسی طرح کبھی فارسی سے ہندی مراد لیتے ہیں جیسے

ہے اگر اے باغباں تو مہربان عندلیب ۔۔۔۔ سامنے رکھ دے سروپا کاٹ بوتیار کو

بوتیار ہندی میں بگلے کو کہتے ہیں جب اس کے سر اور پیر کاٹ دیئے تو گل رہ گیا جو بلبل (سر پیر بگلا) کی دلجوئی کیلئے ضروری ہے اور باغبان کو اسی طرف توجہ دلائی جارہی ہے۔ کبھی عدد بیان کر کے اس سے بہ حساب جمل کوئی حرف بنا لیتے ہیں جیسے۔

کہ اس پر سج رہا ہے ع وش وقاف کا جوڑا ۔۔۔۔ رہے گا چار سو ستر برس انشاء زمانے میں

بہ حساب جمل ع کے ۷۰، ش کے ۳۰۰ عدد اور ق کے ۱۰۰ عدد۔ ۴۷۰ سال کبھی یہ ادیب اور شاعر نجوم کی اصطلاح سے شغل کرتے ہیں اور سات سیاروں کا حرف آخر مراد لیتے ہیں یعنی شمس کا س قمر کا ر مشتری کا ی عطارد سے د زہرہ سے ہ زحل سے ل، مریخ سے خ

کبھی کسی لفظ کا الٹ دینا مطلوب ہوتا ہے جیسے حکیم مومن خان مومن کا یہ شعر

بنے کیوں کر کہ ہے سب کار اُلٹا   ہم اُلٹے بات اُلٹی یار اُلٹا

ہم کو الٹ دیں تو مہ، بات کو الٹ دیں تو تاب اور یار کو الٹ دیں تو رائے، گویا مہتاب رائے کو معمے میں مخفی کیا تھا۔ بعض تلمیحات معمے کی شکل اختیار کرتی ہیں جیسے

موسیٰ پہ خوں کا دعویٰ کروں گا بروز حشر   کیوں اس نے آب دی مرے قاتل کی تیغ کو

یعنی موسیٰ نے اللہ سے جلوہ دکھانے کی ضد کی تجلی الٰہی سے طور کا پہاڑ جل کر سرمہ بن گیا اور وہ سرمہ میرے محبوب کی آنکھوں میں لگا جس سے آنکھوں کا حسن بدرجہا بڑھ گیا اور میرا دل گھائل ہوا چنانچہ اس تمام کارروائی کے ذمہ دار موسیٰ ہیں۔ اسی قبیل کا وہ شعر ہے۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا   کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

مضمون کی ابتداء میں اسم کے حصول کے جو چار اسباب بیان کئے گئے اس کے چوتھے سبب کی ایک مثال وہ شعر ہے جو میں نے زمانہ طالب علمی میں اپنے اردو اور فارسی کے استاد سے سنا تھا۔ قارئین کو میں اسی لطف میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ کیجیے

مانگا تھا میں نے اس بت نظارہ ساز سے   ابجد کے دائرے میں نظیرہ عراق کا

مفہوم کے لئے ابجد کا دائرہ بنایئے۔ دائرہ پر اٹھائیس نقطے برابر فاصلے پر لگا کر مرکز سے ملا دیجیئے اور ہر نقطے کے اوپر ابجد کے حروف جدا جدا کر کے لکھئے اب عراق کے حرف کو تلاش کر کے یعنی ع راق کو خط کشیدہ کیجئے پھر ع خط کے دوسرے سرے پر جو حرف نقطے کے اوپر لکھا ہے وہ پڑھیئے پھر ر، ا، اور ق کے مقابل حروف لکھئے تو کچھ یوں ہوگا۔ ع = ب، ر = و، ا = س اور ق = ہ۔ لفظ بنا بوسہ۔ یہ عراق کا نظیرہ ہوا۔
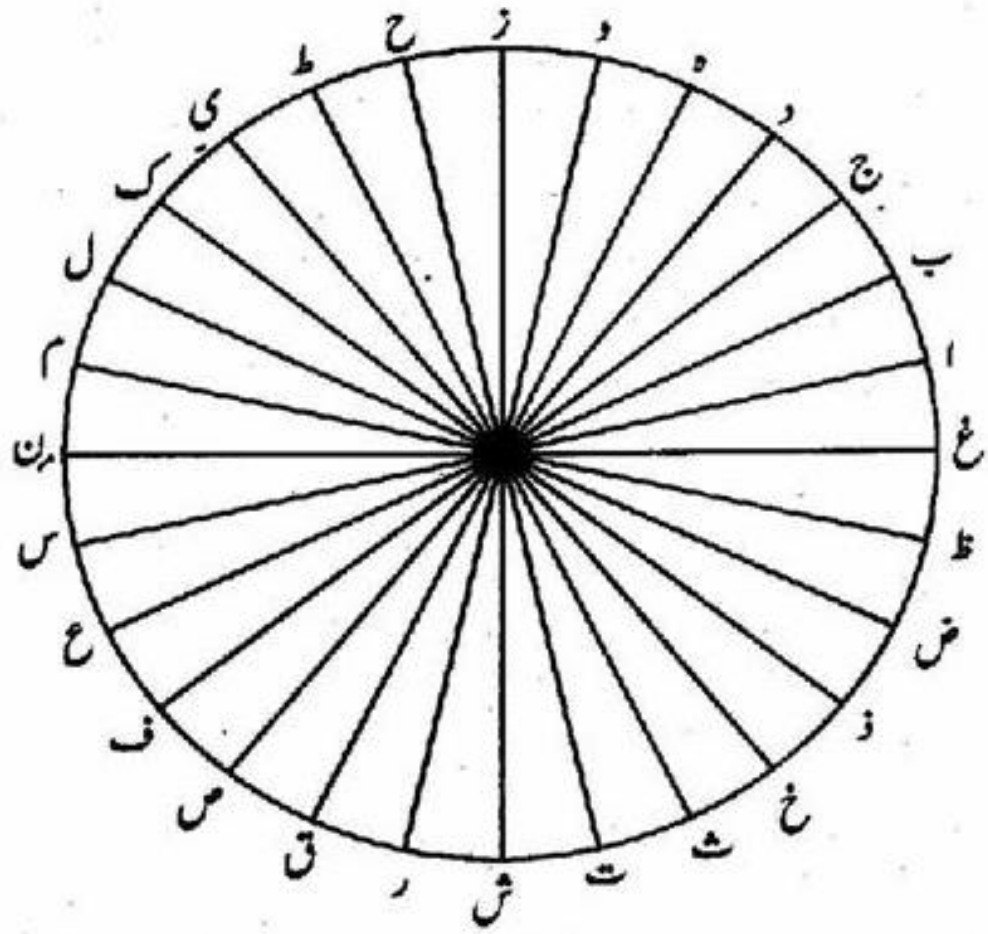
یہ کوشش کسی کے مفید مطلب ہو نہ ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر یا ادیب حروف کی ماہیت اور ان کے استعمال سے کما حقہ آگاہ ہے اور اس کی ذہنی اپج سے شعر دلچسپ ہو گیا۔ زبان میں وسعت پیدا کرنے کے یہی طریقے ہیں۔ افسوس اس امر کا ہے کہ ان عجائبات کا ریکارڈ کبھی مرتب نہیں کیا گیا جبکہ یہ بھی کلاسیکی ادب کا اثاثہ ہے۔

محمد شفیع عارف دہلوی

شمس العلماء حضرت حسن نظامی دہلویؒ

کاروان انسانیت ابتدائے آفرینش سے رواں دواں ہے اور جب تک یہ دنیا اپنی قبائے رنگین میں جلوہ ریز ہے شیرازہ آب وگل یونہی سنورتا اور بگڑتا رہیگا اس لئے کہ ہست ونیست وجود وعدم اور بقا وفنا کا مرحلہ تو قسام ازل نے ہر ذات اور ہر شے کیلئے مقدر فرمادیا ہے اس سے مفر کہاں مگر بعض ہستیاں اپنی قابلیت اخلاق اور کردار کے اعتبار سے اتنی عظیم ہوتی ہیں اور اپنی حیات مستعار میں ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیتی ہیں کہ تاریخ انہیں اپنے دامن میں جگہ دینے پر مجبور ہوتی ہے ایسی ہی ایک عظیم اور یگانہ روزگار ہستی شمس العلماء مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کی ہے جنہیں نازشِ دانش وبینش، جمال آدمیت اور شمع عرفان وآگہی جو کچھ کہا جائے جس نام سے بھی پکارا جائے زیب دیتا ہے۔

یوں تو برصغیر پاک وہند میں بیشمار ایسے علمائے کرام بزرگان دین اور صوفیائے عظام گزرے ہیں جنہوں نے اپنی مایہ ناز تصانیف بصیرت افروز تقاریر اور عرفان وآگہی سے لاکھوں افراد کے قلوب منور کیے اور اپنے علم وعمل اور فیض محبت سے ایسی شمعیں فروزاں کیں کہ عالم انسانیت کے تمام دریچے تابندہ وتابناک ہوگئے مگر شمس العلماء مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جسکا ہر رخ اور ہر گوشہ جلوہ فروش صد طور تھا وہ بیک وقت ایک جید عالم دین ممتاز بزرگ عظیم صوفی ایک لاجواب مقرر اور ایک مایۂ ناز ادیب تھے۔

ایک عالم دین کی حیثیت سے آپ نے نہ صرف قرآن مجید کی اردو زبان میں نہایت سلیس اور جامع تفسیر قلمبند کی بلکہ دینی مسائل پر مبنی درجنوں ایسی نادر ونایاب کتب سپرد قلم کیں کہ آپ کے ہمعصر تمام علماء کرام آپ کے ادراک، صلاحیت اور عظمت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے۔

ایک بزرگ کی حیثیت سے حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کا سلسلہ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اور بحیثیت ایک صوفی آپکا دامن عقیدت وارادت سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی سے وابستہ تھا اور ان دونوں عظیم المرتبت ہستیوں کے روحانی فیوض وبرکات کا ظہور آپ کی ذات ستودہ صفات

میں جلوہ ریز تھا۔

آپکا مبلغ علم اور مشاہدہ اتنا وسیع و وقیع تھا کہ الجھے ہوئے ذہنوں کیلئے شریعت اور وحدۃ الوجود کے باہمی ربط، مطابقت اور طریقت و معرفت کے مسائل پر اس طرح روشنی ڈالتے ایسی توجیہ و تشریح فرماتے کہ بات ذہن گیر ہو جاتی فقر و تصوف اور کشف و وجدان آپکی بزرگی اور صوفیت کے وہ روشن رخ ہیں جو آپکی نجی اخلاقی معاشرتی علمی ادبی اور عرفانی زندگی کے تمام دوائر پر حاوی ہیں۔

مشرب و مسلک کے اعتبار سے "فقر و تصوف" میں آپکا مسلک چشتی نظامی اور فقہی مسلک حنفی تھا نظامی مسلک نے آپ کو ذوق سماع اور چشتی مسلک نے سوز و گداز اور طریق عشق سے سرفراز فرمایا۔ آپکے علمی مدارج کیلئے آپکی تصانیف کے علاوہ، شب و روز کی وہ محفلیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں جن سے لوگوں کے قلوب پر حضرت خواجہ صاحبؒ کے ذہنی ارتقاء اور قلبی واردات و کیفیات کے لطیف اثرات مرتسم ہوتے اور وہ فیضیاب ہوتے خواجہ حسن نظامی دہلویؒ انسانیت کے اس بلند مقام پر فائز تھے جہاں بلاتخصیص مذہب و ملت اور حیثیت و منصب آپ سب سے یکساں محبت فرماتے اور یہی وہ مقام ہے جو کسی انسان کو اشرف المخلوقات ہونیکا درجہ عطا کرتا ہے آپ کے چاہنے والوں میں آپ کے حلقہ ارادت اور عقیدت مندوں کے علاوہ ہندو سکھ عیسائی چھوٹے بڑے سب ہی شامل تھے سب ہی آپ کے گرویدہ اور پرستار تھے۔

ان اوصاف حمیدہ کے ساتھ ساتھ خواجہ صاحب ایک بہترین بلکہ سحر طراز مقرر بھی تھے فن تقریر میں جہاں حق گوئی، انداز بیان، لب و لہجہ، حالات حاضرہ اور تاریخ پر گہری نظر ضروری ہے وہاں مقرر کا کردار اور اسکا سراپا بھی بڑی حد تک اثر انداز ہوتا ہے خواجہ صاحب بڑے دلکش سراپے کے مالک تھے سرو قد کھلتا ہوا گندمی رنگ گنگا جمنی دراز زلفیں۔ خوبصورت ریش مبارک، چھوٹا سا دہانہ، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، منہ میں پان کی گلوری، آنکھیں ایسی پرکشش اور روشن جیسے قدرت نے ہیرے کی کنی کوٹ کی بھردی ہو نہایت چمکدار اور کشادہ پیشانی عینک سے مزین پر وقار چہرہ جسے دیکھ کر احتراماً نگاہیں جھک جائیں۔

لباس انتہائی سادہ، پاجامہ، اسپر ٹخنوں سے اونچا کرتا، گلے میں خوبصورت لمبا سا سفید رومال اور سر پر مخروطی ٹوپی، گفتگو میں بلا کی شیرینی اور حلاوت نہایت آہستہ لہجہ میں گفتگو فرماتے اور یہ محسوس ہوتا جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں آپکی آنکھ میں موہنی اور زبان میں جادو تھا مردم شناسی اور قیافہ شناسی کے ماہر، غضب کے حاضر دماغ، بلا کے حاضر جواب مگر نہایت شائستہ اور تہذیب یافتہ مردم آزاری سے دور، ہمدرد، متواضع اور

محیرّ، جب تقریر فرماتے تو فضا پر ایک سکوت طاری ہو جاتا لوگ گوش برآواز، چہرہ پرنور پر نظریں جمائے دل کے دریچے وا کیئے ہمہ تن متوجہ خواجہ صاحب نہایت سلیس اور آسان زبان میں بہت ہی دلکش اور دلنشیں انداز میں تقریر فرماتے ہر بات حق اور آئینہ کی طرح صاف دل پر اثر کرنے والی دل میں اتر جانے والی ایک سماں بندھ جاتا مسلم لیگ اور پاکستان کی حمایت میں ایسی بصیرت افروز تقاریر فرمائیں کہ ہر مسلمان مسلم لیگ کا شیدائی اور پاکستان کا دیوانہ بن گیا۔

خواجہ صاحب کی شخصیت کا ایک بہت اہم اور قابل رشک پہلو یہ ہے کہ آپ برصغیر انڈو پاک کے ان چند مایہ ناز ادیبوں میں سے ایک تھے جن پر دنیائے ادب صدیوں ناز کرتی رہے گی خواجہ صاحب ایک منفرد انداز نگارش کے مالک تھے ملک کے بہت سے ادیبوں نے آپ کے آہنگ اور اسلوب کو اختیار کرنے اور اپنانے کی کوشش کی مگر کسی کو وہ طرز نگارش حاصل نہ ہو سکا جو جناب خواجہ کا خاصہ تھا۔ آپکو سلیس، رواں شگفتہ، انتہائی عام فہم اور آسان زبان لکھنے میں ید طولیٰ حاصل تھا حسن بیان کا عالم یہ تھا کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ کھنچ جاتا۔ تصویر بنکر نظروں کے سامنے آجاتی یہی وجہ تھی کہ آپ کو مصور فطرت کہا جاتا تھا چھوٹے چھوٹے ڈھلے ڈھلائے حسین فقرے بجلی کے شراروں کی طرح درخشندہ و تابندہ جو قارئین کے دلوں پر نقش ہو جائیں یوں محسوس ہوتا جیسے شگفتہ وشاداب پھول دامن نگاہ میں بھر گئے ہوں۔

دلّی کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ اسکی کوکھ سے بڑے بڑے فنکار شاعر اور ادیب پیدا ہوئے مگر علامہ راشد الخیری۔ ادیب الملک نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی اور جناب خواجہ حسن نظامی دہلویؒ جیسے عظیم ادباء کے پُر مغز مضامین اور تصانیف نے ان کے قلم سحر کار کی گوہر ریزیوں سے جو تابندگی حسن حاصل کی وہ کسی اور ادیب کے حصہ میں نہ آسکی اور شاید ان جیسے ادباء کیلئے زمانے کو صدیوں انتظار کرنا پڑے حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کے مضامین میں روانی کا یہ عالم تھا جیسے ایک دریا، ایک سمندر نہایت پرسکون اور سبک روی کے ساتھ بہہ رہا ہو۔

یوں تو خواجہ صاحب کی تصانیف کا سلسلہ بہت وسیع ہے سینکڑوں کتب پر مشتمل ہے مگر ان کی نادر روزگار تصانیف جن کو شہرت دوام حاصل ہوئی ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔ سی پارہ دل (ادبی مضامین کا مجموعہ) کائنات ہستی (ادبی مضامین) دوسرا مجموعہ کانا باتی۔ (آل انڈیا ریڈیو اور دلی سے نشر شدہ تقاریر کا مجموعہ) ایڈورڈ ڈائری (ایڈورڈ ہفتم اور مسز سمپسن کے معاشقے پر ایک ادبی تبصرہ) قلمی چہرے (ہم عصر مشاہیر

کے قلمی خاکے) جہانگیر کا روز نامچہ (شہنشاہ جہانگیر کی خودنوشت تزک جہانگیری کا دلکش ترجمہ) نظامی بنسری (حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی بے مثال سوانح حیات) بیگمات کے آنسو (بہادر شاہ ظفر کی شہزادیوں کی داستان الم) تاریخ فرعون (حضرت موسیٰ اور فرعون کے واقعات اور قدیم مصر کی تاریخ) آپ بیتی (اردو کی پہلی خودنوشت سوانح عمری) خواجہ حسن نظامی کا سفر نامہ (سفرنامہ شام و فلسطین و حجاز ۱۹۱۱ء) ''چٹکیاں گدگدیاں'' (فکاہیہ تحریروں کا مجموعہ)

خواجہ صاحب اردو میں کئی چیزوں کے موجد اور بانی تھے - جن میں ''روزنامچہ''، ''قلمی چہرے''، ''چٹکیاں گدگدیاں'' (اردو میں سنجیدہ مزاح کی غالباً یہ پہلی کتاب ہے) اسی طرح ''آپ بیتی'' اردو میں پہلی خودنوشت سوانح عمری ہے اس سے پہلے کسی ادیب نے یہ چیزیں سپرد قلم نہیں کیں -

حیرت کی بات ہے کہ ایک فرد واحد نے کئی سوایسی نایاب اور بیش بہا تصانیف سپرد قلم کیں - ان تصانیف کی افادیت اور شہرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بابائے اردو جناب مولوی عبدالحق نے فرمایا کہ اگر اردو زبان سیکھنا مقصود ہو تو شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی کے مضامین کا مطالعہ کیجئے - یہ صرف توفیق ایزدی تھی ورنہ ''ایں سعادت بزور بازو نیست'' دراصل خواجہ صاحب کی ذات ایک انجمن - ایک مکمل تنظیم اور ایک وسیع ادارہ کی سی تھی جس نے اس قدر وسیع اور وقیع کام سرانجام دیا -

حضرت خواجہ صاحب کے حسن تربیت اور فیض صحبت کا عالم یہ تھا کہ جو شخص آپ کے ساتھ صرف ایک املا نویس کی حیثیت سے منسلک ہوا وہ چند ہی سال میں ایک اچھا ادیب اور ایک کامیاب صحافی بن کر دنیائے ادب وصحافت پر چھا گیا - اس ضمن میں جناب ظفر نیازی - مفتی شوکت علی فہمی، سید عزیز حسن بقائی اور جناب ایم - اے نعیم کے اسمائے گرامی بطور سند پیش کیے جاسکتے ہیں جناب ظفر نیازی نے ''نقاد'' اور ''کامیاب'' - مفتی شوکت علی فہمی نے ''دین دنیا'' اور عزیز حسن بقائی نے ''ماہنامہ پیشوا'' اور حریت ویکلی جیسے کامیاب پرچے جاری کیے اور بہترین مدیر ثابت ہوئے - اسی طرح جناب ایم اے نعیم جنہیں خواجہ صاحب نے ''یمین القلم'' کا خطاب عطا فرمایا تھا (کراچی پاکستان آنے کے بعد جناب شیخ عنایت اللہ مرحوم بانی (تاج کمپنی لمیٹڈ پاکستان) کے دست راست بنے -

خواجہ صاحب کی زندگی کسی گوشہ نشین ادیب کی سی نہ تھی بلکہ آپ کی ذات انجمن آرا تھی - نہ جانے کتنی محفلیں اور کتنی انجمنیں آپ کے دم سے آراستہ تھیں - دوستوں، عقیدت مندوں اور حاجت مندوں کا میلہ

لگا رہتا - آپ ہر شخص سے نہایت خلوص اور محبت سے پیش آتے جو شخص جس کام کے لیے آتا آپ اس کی معاونت فرماتے - کبھی کسی کو مایوس نہ کرتے - آپ کی زبان میں شیرینی، حلاوت، مزاج میں تحمل، قناعت صبر و شکر، ہمدردی، خدا ترسی، خلوص انسانیت اور رواداری بدرجہ اتم موجود تھی - ان اوصاف حمیدہ نے آپ کو بے حد مقبول اور ہر دلعزیز بنا دیا تھا ملک کے بڑے سے بڑے ارباب اقتدار - والیان ریاست سیاسی، سماجی، ادبی غرضیکہ ہر مکتبہ فکر کے لوگوں سے خواجہ صاحب کے نہ صرف ذاتی مراسم و روابط تھے بلکہ ہر شخص آپ کے خلوص، محبت اور عظمت کا معترف اور مداح تھا - قائد اعظم محمد علی جناح، پنڈت جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مسیح الملک حکیم اجمل خان، علامہ اقبال، ادیب الملک نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی (بانی اردو مجلس) مصور غم علامہ راشد الخیری، علامہ مشرقی، مسٹر آصف علی بیرسٹر، ملا واحدی، مولانا رازق الخیری وغیرہ وغیرہ - ان حضرات کے علاوہ بے شمار ایسے صاحبان علم و فضل اور ارباب عقل و دانش آپ کے احباب میں شامل ہیں جن سے خواجہ صاحب کے خصوصی مراسم تھے -

۱۹۴۲ء کی بات ہے جب راقم الحروف دنیائے ادب میں قدم ریز ہوا - ہر چند کہ وہ میر، غالب اور داغ دہلوی کا زمانہ نہیں تھا مگر اس کے باوجود دلی کے قدم قدم اور چپہ چپہ پر ایک سے بڑھ کر ایک گوہر نایاب موجود تھا - ادباء کی بھی بہت بڑی تعداد موجود تھی مگر ان میں چند ایسی عظیم - تاریخ ساز اور قد آور شخصیات تھیں جنھوں نے اردو زبان کے عروج و ارتقاء ---- اور مسلمانان ہند کے ملی شعور کو بیدار کرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں ان میں شمس العلماء مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کے علاوہ ادیب الملک نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی - جناب ملا واحدی اور جناب مولانا رازق الخیری سابقہ مدیر اعلیٰ عصمت دہلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں -

خواجہ حسن نظامی صاحب کے میرے والد صاحب سے بڑے دیرینہ اور قریبی مراسم تھے - اس لئے راقم الحروف کو بچپن ہی سے خواجہ صاحب کی محفلوں میں جانے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا مگر جب میں نے دنیائے ادب میں قدم رکھا تو یہ روابط اور زیادہ گہرے ہو گئے مگر اس کے باوجود میری ادبی تربیت اردو مجلس ہی میں ہوئی جس کے بانی جناب خواجہ محمد شفیع دہلوی تھے - اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۲ء میں حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کی عمر عزیز تقریباً ستر سال کی تھی اور اس زمانے میں وہ تصنیف و تالیف کے کام میں بہت مصروف ہو گئے تھے - اس کے علاوہ ایک عظیم صوفی کی حیثیت سے ان کا حلقہ ارادت اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ ادبی محفلوں

میں شرکت کرنے کیلئے ان کے پاس بالکل وقت نہیں تھا اس کے برعکس خواجہ محمد شفیع صاحب بالکل جوان تھے اور انکی ادبی سرگرمیاں عروج پر تھیں - کوئی بڑی ادبی محفل یا انڈیا فیم کا مشاعرہ جناب خواجہ شفیع صاحب کی صدارت کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا آج اگر میں دو لفظ لکھ لیتا یا کہہ لیتا ہوں تو یہ سب خواجہ شفیع صاحب کا فیض ہے-

جناب ایم اے نعیم جو خواجہ حسن نظامیؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے اور جنہیں موصوف نے یمین القلم کا خطاب دیا تھا فرماتے ہیں '' میرا اور خواجہ صاحب کا ساتھ بہت طویل عرصہ تک رہا ہے اور میں ان کے ہمراہ بے شمار شہروں اور محفلوں میں گیا ہوں لیکن میں نے ان جیسی محبوبیت مقناطیسیت ، فہم و فراست ، ذہانت و ذکاوت ، حاضر دماغی اور حاضر جوابی کسی دوسرے فرد میں نہیں دیکھی - وہ جہاں بھی جاتے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے - ایک مرتبہ میں خواجہ صاحب کے ہمراہ ریاست حیدر آباد دکن میں تھا - میں نے دیکھا کہ میر عثمان علی خان والئی دکن نے بڑی محبت سے خواجہ صاحب سے دریافت کیا --- کہ آپ نے میرے ملک میری ریاست میں کیا دیکھا --- خواجہ صاحب نے بے ساختہ فرمایا '' '' دوس '' اور '' دوش '' - فرمایا اس کا مطلب کیا ---- ' سازش اور سفارش '' - اس جرات مندانہ اور حقیقت پسندانہ جواب پر نواب صاحب حیرت زدہ رہ گئے-

نواب صاحب نے پھر سوال کیا - کیا آپ حضرت علیؓ کی افضیلت کے قائل ہیں - خواجہ صاحب نے جواب دیا - '' جی ہاں میں حضرت علیؓ کو افضل مانتا ہوں - نظام نے کہا آپ افضل کیوں مانتے ہیں - خواجہ صاحب نے کہا اس لئے کہ میں ان کی اولاد میں سے بھی ہوں اور ان کے مریدوں میں سے بھی - ہر بیٹا اپنے باپ اور ہر مرید اپنے پیر کو دوسروں سے افضل مانتا ہے - نظام نے پوچھا ترتیب خلافت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے - خواجہ صاحب نے جواب دیا ترتیب خلافت صحیح تھی نظام نے کہا ترتیب خلافت صحیح تھی تو پھر علیؓ کی افضلیت کیونکر باقی رہی خواجہ صاحب نے فرمایا --- '' جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی افضیلت اپنی جگہ قائم ہے حالانکہ وہ سب رسولوں کے بعد تشریف لائے اسی طرح حضرت علیؓ کی افضیلت اپنی جگہ قائم رہی خواہ وہ خلفائے راشدین میں سب کے بعد ہوئے بعد میں ہونا تو افضیلت کے مخالف نہیں مطابق ہے - اس پر نظام نے خواجہ صاحب کے ہاتھ چومے اور کہا خواجہ صاحب '' آج آپ نے میرے دل کا کانٹا نکال دیا -

دہلی میں کسی اپنی محفل میں خواجہ صاحب کو ایک تقریر کرنی تھی - قبل اس کے کہ آپ تقریر شروع کرتے کچھ لوگ کھڑے ہوئے اور کہا خواجہ صاحب ! پہلے آپ ہمارے ایک سوال کا جواب دیجیے - خواجہ صاحب نے فرمایا - پوچھیے - سوال '' قوالی سننا جائز ہے یا ناجائز ؟ '' خواجہ صاحب نے برملا فرمایا - آپ کے

سوال کا جواب خود سوال میں موجود ہے- وہ لوگ اس اشارے کو نہیں سمجھے اور حیرت سے پوچھا وہ کیونکر---
فرمایا'' آپ کے سوال میں لفظ جائز دو مرتبہ اور نا کا لفظ ایک مرتبہ استعمال کیا گیا ہے- فیصلہ اکثریت کے حق میں ہوگا- اکثریت جائز کی ہے پس قوالی سننا جائز سمجھنا چاہیئے-

خواجہ صاحب کی حاضر دماغی اور حاضر جوابی کے بے شمار واقعات ہیں مگر مضمون کی طوالت مانع ہے اس لیے انہی پر اکتفا کرتا ہوں-

الغرض مصور فطرت خواجہ حسن نظامی دہلوی جنہیں حکومت برطانیہ نے شمس العلماء کے خطاب سے نوازا تھا دلی کی ایک ایسی محبوب اور قابل صد افتخار ہستی تھی جنہوں نے اردو زبان کے فروغ اور مسلمانان ہند کے ملی شعور کو اجاگر کرنے کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی- جنہوں نے تقسیم ہند کے موقع پر دلی کے ان گلی کوچوں کو جن کے متعلق کبھی میر تقی میر نے فرمایا تھا کہ ---- '' دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے- جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی'' خوں آشام و خوں غلطیدہ ہوتے دیکھا اور مسٹر ماؤنٹ بیٹن آخری وائسرائے ہند اور بھارت کے پہلے گورنر جنرل سے ---- اور پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم بھارت سے مسلمانان ہند کے بے دریغ قتل عام پر اپنی سخت برہمی کا اظہار کیا ----

سلام اس پیکر جرأت و شجاعت پر جس نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس زمانے میں جب حکومت برطانیہ کے اقتدار کا سورج دنیا کے کسی حصہ میں غروب نہیں ہوتا تھا اس کو--- اس کے دور اقتدار میں رہتے ہوئے اس کے ظلم اور اس کی ناانصافیوں کا آئینہ دکھایا ---- بہادر شاہ ظفر جیسے نیک سیرت آخری تاجدار ہند کے رنگون میں پابند سلاسل ہونے ----شہزادوں کے سر تن سے بریدہ ہونے --- لال قلعہ کی دلخراش بربادی اور بیگمات کے بہتے ہوئے آنسوؤں کے دل فگار مناظر قلمبند کیے- اس کے علاوہ سینکڑوں ایسی بصیرت افروز اور نادر و نایاب ادبی نگارشات کا مایہ ناز ورثہ آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑا جن سے عصر حاضر کے ارباب عقل و دانش آج بھی لولوئے آبدار رول رہے ہیں- ایسی عظیم ہستیاں دس بیس پچاس سال میں نہیں بلکہ صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں- '' خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را- ''

سیدہ نغمہ زیدی

اقبال کا نظریہء تعلیم

علم وہ نور ہے جس کی روشنی سے یہ جہاں آب وگِل منور ہے اور جس کی برکت سے انسان اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا عملی ثبوت پیش کر رہا ہے اور علم کی قوت سے ہی وہ تسخیر کائنات کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف زمانوں میں تعلیم و تربیت کے نظام کی بنیاد مشاہیر کے افکار و نظریات پر استوار ہوتی رہی ہے۔ قدیم یونانی حکماء و علماء، ارسطو، افلاطون اور سقراط سے لے کر مسلمان ماہرین تعلیم امام ابو حامد محمد ابو غزالی، علامہ عبدالرحمٰن بن خلدون اور مغربی مفکرین تعلیم روسو، پستالوزی اور جان ڈیوی تک تمام اہل عقل و دانش نے اپنے اپنے عہد میں تعلیم کی فنی اور عملی صورت پر بحث کی ہے اور مسائل تعلیم کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور اپنے فلسفہ حیات میں مناسب جگہ دی ہے۔ تعلیم و تربیت کا کام نظری کم اور عملی زیادہ ہے۔ اس لئے علامہ اقبال کو مفکر تعلیم یا ماہر تعلیم کہنا مناسب معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ بقول قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی ''اقبال نہ تو فن تعلیم کے ماہر تھے نہ انہوں نے اس فن کی تحصیل کی تھی۔ نہ اس موضوع پر کوئی کتاب لکھی۔ بجز اس کے کہ کچھ مدت تک بحیثیت پروفیسر کالج میں درس دیتے رہے۔ کوئی مستقل تعلیمی فلسفہ انہوں نے پیش نہیں کیا'' اس موضوع پر انہوں نے سب سے پہلے اپنی شاعری کے تیسرے دور میں اپنے خیالات ظاہر کئے۔ چنانچہ بانگ درا کے دور سوم کی نظموں میں دو ایک نظمیں تعلیم پر بھی ملتی ہیں۔ بایں ہمہ اقبال کے تعلیمی افکار سے کلیتاً صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے تعلیم کی فنی اور عملی صورتوں پر غور کیا ہے۔ اپنے عہد کے نظام تعلیم پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور مشرق و مغرب کے فلسفہ تعلیم اور نظام تعلیم کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ مسئلہ تعلیم سے اقبال کی نظری و عملی دلچسپی کا ثبوت ۱۹۱۲ء سے ملتا ہے جب مسٹر گوکھلے نے امپیریل لیجلیٹو کونسل میں جبری یا لازمی تعلیم کا ایک مسودہ پیش کیا۔ یہ مسودہ سیاسی تنظیموں کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی بنیادوں پر بھی زیر بحث رہا۔ مختلف علاقوں اور شہروں میں اس کی وضاحت اور تائید و تردید کے جلسے کئے گئے۔ ایک بڑا جلسہ اسلامیہ کالج لاہور میں ۱۸ فروری ۱۹۱۲ء کو علامہ اقبال کی زیر صدارت ہوا۔ اس مسودے میں ''جبریہ'' کا لفظ خاص طور پر موضوع گفتگو تھا اور مسلمان رہنما جبری تعلیم کو اسلام کے منافی سمجھتے تھے۔ لیکن علامہ اقبال نے

گو کھلے کے مسودے کی پرزور اور کھلی تائید کرتے ہوئے اپنے خطبہ صدارت میں کہا!

''لفظ جبریہ کسی کو کھٹکنا نہیں چاہیے جس طرح چیچک کا ٹیکہ لازمی اور جبری قرار دیا گی ہے اور یہ لزوم و جبر اس شخص کے حق میں کسی طرح مضر نہیں ہوسکتا جیسا کہ ٹیکہ لگایا جاتا ہے اسی طرح جبریہ تعلیم بھی گویا روحانی چیچک کا ٹیکہ ہے۔ اسلام میں جبری تعلیم موجود ہے مسلمانوں کو حکم ہے کہ اپنے بچوں کو زبردستی نماز پڑھائیں۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس جبریہ تعلیم کے قانون کی حد میں لڑکیاں بھی آ جائیں گی مگر ہم چاہیں تو اس شق کو قانون سے نکلوانے کی کوشش کرسکتے ہیں اس بل پر اس وقت تک جو اعتراض ہو چکے ہیں وہ بالکل لغو اور بیہودہ ہیں۔''

اس بیان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اقبال تعلیمی مسائل میں گہری دلچسپی رکھتے تھے لیکن جب ۱۹۱۵ء میں اسرار خودی اور ۱۹۱۸ء میں رموز بے خودی کی اشاعت کے ذریعے ان کا فلسفہ خودی منظر عام پر آیا تو تعلیم کے سلسلے میں ان کے فکری پہلو بھی سامنے آئے۔

اس کے علاوہ انہوں نے اپنے ابتدائی دور تدریس میں ''بچوں کی تعلیم و تربیت'' کے عنوان سے ماہنامہ مخزن میں ایک مبسوط فنی مضمون لکھا۔ دور شباب کے اس مقالے کے بعض جملے کلاسیکی شان رکھتے ہیں مثلاً قومی عروج کی جڑ بچوں کی تعلیم ہے۔ حقیقی انسانیت یہ ہے کہ انسان کو اپنے فرائض سے پوری پوری آگاہی ہو اور وہ اپنے آپ کو اس عظیم الشان درخت کی ایک شاخ محسوس کرے۔ جس کی جڑ تو زمین میں ہے مگر اس کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھوتی ہیں جو لوگ بچوں کی تعلیم و تربیت کے صحیح اور عملی منصوبوں کو مدنظر نہیں رکھتے وہ اپنی نادانی سے سوسائٹی کے حقوق پر ایک ظالمانہ دست درازی کرتے ہیں۔

دینی تعلیم کے سلسلے میں علامہ اقبال نے ۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو مدراس میں ایک اخباری نمائندے کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

''میں اس امر کی بڑی شدت سے ضرورت محسوس کر رہا ہوں کہ ہماری درس گاہوں میں مذہبی تعلیم بھی ہونی چاہیے۔ یورپ میں تعلیم کا خالصتاً دنیوی طریقہ بڑے تباہی آمیز نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوا ہے میں نہیں چاہتا کہ میرا ملک بھی ان تلخ تجربات سے دو چار ہو۔ یہ امر صاف ظاہر ہے کہ باشندگان ملائیشیا، یورپ کے خالص مادی رویے کو بھی فراموش نہیں کرسکتے ہمارے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ روحانی اور مادی امور کو کس طرح یکجا کیا جائے۔ ہمارے نوجوانوں کی باتیں کہ مذہب کو بالائے طاق رکھ کر تمام تر توجہ سیاسیات پر

دینی چاہیے یورپ کی غلامانہ تقلید کے سوا کچھ نہیں۔ یورپ کی مادہ پرستی اس کی روحانیت اور دوسری اقوام کی مادیت کے لئے پیام موت ثابت ہو چکی ہے۔"

۱۹۱۰ء میں انہوں نے انگریزی زبان میں ایک ڈائری لکھی جس میں ان کے مختلف نظریات وتاثرات ملتے ہیں یہ ڈائری بھی علم و تعلم کے کئی پہلوؤں پر محیط ہے۔ مقصد تعلیم کے بارے میں انہوں نے لکھا۔" قانون حیات کیا ہے؟ جہد پیہم، پس تعلیم کا مقصد کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ جہد حیات کیلئے تیاری" کوئی پانچ برس بعد ۱۹۱۵ء میں مثنوی اسرار خودی میں اس مقصد کو اقبال نے بایں طریق بیان فرمایا۔

آگہی از علم و فن مقصود نیست — غنچہ و گل از چمن مقصود نیست

علم از سامان حفظ زندگی است — علم از سامان تقویم خودی است

علم و فن از پیش خیزان حیات — علم و فن از خانہ زادان حیات

اقبال کے ایک مکتوب سے ان کا مدعا واضح ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ مگر علم، علم حق کی ابتداء ہے۔ وہ علم جو شعور میں نہیں آسکتا اور جو علم حق کی آخری منزل ہے اس کا دوسرا نام عشق ہے" اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطانیت ہے مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے۔ بولہب را حیدر کرار کن۔ اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسانی کیلئے سراسر رحمت ہے۔ اس طرح وہ مغربی مفکر وائٹ ہیڈ سے متفق نظر آتے ہیں۔ جب وہ کہتا ہے کہ "تعلیم کی روح یا اس کا ست یہ ہے کہ وہ دینی ہو۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے اقبال کے نظریہ علم کی تشریح ہو جاتی ہے۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے پہلے خطبہ کا عنوان بھی علم اور دینی واردات ہے جبکہ دوسرے خطبہ" دینی واردات کے مشاہدے کی فلسفیانہ جانچ" کے بیشتر حصے میں بھی اقبال نے علم کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اور ان دونوں خطبوں کے ذریعے ماخذ و مصادر "علم" مثلاً وحی الٰہی، علم نفس، عقل اور حواس خمسہ ہی واضح نہیں کیے بلکہ انہوں نے یقین، علم و تحقیق کو اسلامی نظام تعلیم کا مقصد اعظم بتایا ہے یعنی شک و ظن سے گزر کر علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کے مقام تک جا پہنچنا۔ قرآن مجید کی رو سے علم عمل سے وابستہ ہو کر زیادہ محترم بنتا ہے۔

ذیل کی دو بیتی میں اقبال کس لطافت سے "ظن" سے یقین کی طرف آنے کی تلقین کرتے ہیں

ہمائے علم تا افتد برامت   یقین کم کن گرفتار شکے باش

عمل خواہی، یقیں را پختہ تر کن   یکے جوئے یکے بین و یکے باش

اقبال کے نزدیک تعلیم کا بنیادی مقصد علم کو دینی و روحانی اقدار اور نظریاتی نصب العین کے رنگ میں رنگ دینا ہے۔ وہ حواس، تجربات، مشاہدات اور منطق سے حاصل شدہ حکمیاتی و طبیعاتی علوم کو دین سے علیحدہ کرنا گوارا نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں دین، سائنس اور حکمت ایک ہی مضمون کے مختلف اجزاء ہیں۔ قرآن مجید میں علم بمعنی حکمت بھی وارد ہوا ہے۔ علم نور ہے اور جہالت تاریکی و ظلمت، علم حق (صداقت) کے مترادف ہے جو اسلام کے بھی مترادف ہے۔ لہٰذا جس اسلام کو اقبال فقر غیور بتاتے ہیں اسے ''دین'' بھی کہا جا سکتا ہے قرآن مجید میں علم کی فوقیت کے باعث فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کے آگے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ جب ابوالبشر اشیاء کے خواص و حقائق کے علم سے مکمل طور پر بہرہ مند ہوئے تھے تو اولاد آدم کے علوم و فنون میں بڑھتے رہنے اور تسخیر کائنات میں کامیاب ہوتے رہنے پر تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اقبال علم اور سائنس کو ''علم حق'' قرار دیتے ہیں جبکہ وجدانی یا مشاہداتی علم کو وہ ''عشق'' قرار دیتے ہیں علم با عشق اور علم بے عشق جیسی اصطلاحیں اکثر کلام اقبال میں نظر آتی ہیں علم بے عشق سیکولر یا لادین نقطہ نظر ہے جبکہ علم باعشق دینی نقطہ نظر۔ اقبال علم باعشق کے حامی ہیں۔ انہوں نے سائنسی دور میں معذرت آمیز لہجہ اختیار کئے بغیر اسلام کی فکری اور ایقانی روح کا اثبات کیا ہے اور بیانگ دھل اعلان کیا کہ دینی افکار ابدی ہیں اور سائنس یا فلسفے کے تصورات ان افکار کے مقابلے میں متغیر بھی ہیں اور فروتر بھی۔ اقبال فرماتے ہیں کہ

''اسلام نے ایک حقیقی اور تحقیقی (مبنی بر حق) نظام پیش کیا ہے۔ لہٰذا یونانی و عجمی تصورات خواہ فلسفہ کے روپ میں آئیں یا تصوف کے لبادے میں وہ اسلام کے اصولوں پر پرکھے جائیں گے اور اس معیار پر رد یا قبول کئے جائیں گے۔''

گویا اقبال کے فکر و فلسفہ کا مبداء و ماخذ اسلام ہے۔ مردان حق علم حق سے صحیح استفادہ کرتے رہے مگر اہل یورپ اس علم کے ذریعے نوع انسانی کے خاتمے کے درپے ہیں۔ چنانچہ جاوید نامہ میں بھی فرماتے ہیں

ہر چہ می بینی زانوار حق است   حکمت اشیاء زاسرار حق است

ہر کہ آیات خدا بیند حراست   اصل ایں حکمت زحکم ''انظر'' است

بندہ مومن از و مہر وز تر   ہم بہ حال دیگراں دل سوزتر

علم چوں روشن کند آب و گلش | از خدا ترسندتر گرد د دلش
علم اشیا خاک مارا کیمیاست | آہ درافرنگ تاثیرش جداست
عقل و فکرش بے عیار خوب وزشت | چشم او بے نم دل او سنگ وخشت
علم از و رسواست اندر شہر ودشت | جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت
دانش افرنگیاں تیغے بدوش | در ہلاک نوع انساں سخت کوش
باخسان اندر جہان خیر و شر | درنسازد مستیء علم و ہنر
آہ از افرنگ و از آئین او | آہ از اندیشۂ لا دین او
علم و حق را ساحری آموختند | ساحری نے کافری آموختند

علامہ اقبال نے مغربی نظام تعلیم اور نظام فکر کا بھی بغور مطالعہ کیا تھا اس لئے وہ مغربی علوم اور ان کے حصول کے طریقوں پر صحیح رائے قائم کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

پڑھ لئے میں نے علوم شرق وغرب | روح میں باقی ہے اب تک درد وکرب

مغربی تعلیم کو وہ نوجوان نسل اور ملک وقوم کے لئے اس لئے مضر اور نقصان دہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کا ذہنی ارتقاء تو ضرور ہوا لیکن وہ ان کے روحانی انحطاط کا سبب بھی بنی ہے۔ اقبال اسلامی نظام تعلیم اور قرآنی مقاصد تدریس کے مبلغ تھے اقبال اسلامی علوم کے تقاضوں کے مطابق ہر قسم کے علوم وفنون کے اکتساب کے سخت حامی تھے بشرطیکہ کوئی علم وفن ''خودی'' کے خلاف نہ ہو۔ وہ انسانوں کو تکمیل نفس کی تلقین کرتے ہیں تعلیم کا اصل مقصد خودی کی نشو ونما ہے۔ علامہ اقبال اس امر کا بخوبی احساس رکھتے ہیں کہ نفس انسانی کی انفرادی حیثیت کا ایک پہلو عقل کے استعمال اور علم کے حصول سے محکم ہوتا ہے لیکن اقبال کا میلان مذہبی وروحانی ہے۔ اس لئے فلسفے کا ذوق رکھنے کے باوجود وہ عقل طبعی اور عقل استدلالی سے آگے بڑھ کر وجدانی والہامی علم کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ تعلیم کے سلسلے میں ان کا نقطہ نظر ان کے فلسفہ خودی سے الگ نہیں ہے اور فلسفہ خودی کی روح عظمت آدم اور احترام آدمیت ہے وہ ایک ایسا تعلیم یافتہ معاشرہ تشکیل دینا چاہتے تھے جس کی بنیاد نسل ورنگ یا علاقائی تفریق کے بجائے اخوت انسانی اور عالمگیر انسانی برادری پر رکھی گئی ہو اور جس میں کوئی بڑی طاقت کسی کمزور قوم کے حقوق سلب نہ کر سکے اور بلا تفریق مذہب وملت ہر شخص کو تکمیل خودی کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ ان کی مراد علم نافع سے ہے جس کے ثمرات سے آقا وغلام دونوں مستفید ہو سکیں اور تکمیل خودی

سے فرد میں ایسی لچکدار اور متوازن سیرت و کردار تخلیق ہو جس کے سہارے وہ زندگی کے سارے نشیب و فراز سے کامیابی کے ساتھ گزر سکے۔ اقبال کا خودی کی تربیت و استحکام پر زور دینا اور خداشناسی کے لئے خودشناسی کو مقدم جاننا اس امر پر صریح دلالت کرتا ہے کہ وہ ذاتی اور غیر رسمی تعلیم جو فرد اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں سے حاصل کرتا ہے رسمی اور کتابی تعلیم کے مقابلے میں زیادہ صحت مند، توانا اور قابل اعتماد سمجھتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

اقبال یہاں نام نہ لے درس خودی کا	موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے مموَلوں کی نظر سے	پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

لہذا ان کے تصور تعلیم میں ایسی کوئی بات مستحسن نہیں ہو سکتی جو مرگ خودی کی علامت ہو۔ دراصل اقبال علم و عشق کے ربط کے قائل ہیں اقبال نے اپنے کئی اشعار میں علم با عشق اور علم بے عشق سے اپنا مفہوم ظاہر کرنے کی سعی کی ہے علم بے عشق سیکولر یا لادین نقطہ نظر ہے جبکہ علم با عشق دینی نقطہ نظر اقبال علم با عشق کے حامی ہیں۔ فرماتے ہیں۔

گفت حکمت را خدا خیر کثیر	ہر کجا ایں خیر را بینی، بگیر
دل اگر بندد بحق، پیغمبری است	ور زحق بیگانہ گردد کافری است
علم را بے سوز دل خوانی شر است	نور او تاریکی بحر و بر است
عالمے از غاز او کور و کبود	فرودینش برگ ریز ہست و بود
قوتش ابلیس را یارے شود	نور نار از صحبت نارے شود
از جلال بے جمالے الاماں	از فراق بے وصالے الاماں
علم بے عشق است از طاغوتیاں	علم با عشق است از لاہوتیاں
بے محبت علم و حکمت مردۂ	عقل تیرے بر ہدف ناخوردۂ

علامہ اقبال نے اپنے زمانے کے دینی مدارس پر بھی نکتہ چینی کی ہے کیونکہ دینی مدارس میں قرآن و حدیث کی تعلیم جس طریقے سے دی جاتی ہے وہ طلباء کو ارکان اسلام اور فقہی مسائل سے تو آگاہ کر دیتی ہے لیکن وہ دین کی روح سے آشنا نہیں ہوتے اور وہ فقہی اور فروعی مسائل کے اختلافات میں مبتلا ہو کر لڑائی جھگڑے اور کفر کے فتوے صادر کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور ان مدرسوں کے تربیت یافتہ لوگ تنگ نظری، تعصب اور

جہالت کی وجہ سے دین کی کما حقہ خدمت سرانجام نہیں دیتے ۔ مثلاً اقبال اس لئے بیزار ہیں کہ اس کے پاس دین ہے، دین کی حرارت نہیں، اس کا نماز روزہ رسمی ہو کر رہ گیا ہے اور دین کی حقیقی تعلیم دینے کے بجائے بحث وتکرار اور فرقہ واریت میں مبتلا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک ۔۔۔ نہ زندگی ، نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے ۔۔۔ خانقاہوں میں کہیں لذت اسرار بھی ہے

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے ۔۔۔ اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

قدیم دینی مدارس کی جامد، بے روح اور زمانے کے تقاضوں سے ناآشنا تعلیم کے ساتھ ساتھ اقبال جدید انگریزی تعلیم سے بھی نالاں تھے۔ اپنے عہد کے تعلیمی نظام پر اقبال کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے وہ لا دینی اور بے یقینی کے خیالات کو ہوا دیتا ہے۔ موجودہ تعلیم سے ذہن میں کسی حد تک جلا تو پیدا ہوتی ہے دل بے نور رہتے ہیں۔ مغربی تعلیم کی بنیاد ہی مادہ پرستی پر ہے، وہ عقل پرستی، تن پروری، تعیش و آرام کی دلدادگی کا سبق دیتی ہے اور اس کی روح بلند مقامات سے خالی ہے اقبال کی دور بیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ مغرب کا نظام تعلیم مادی ترقی کی دھن میں جن غیر اخلاقی بنیادوں پر استوار ہوا ہے وہ بہت جلد خود اپنی تباہی کا سبب بن جائے گا۔ چنانچہ بال جبریل میں فرماتے ہیں۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے ۔۔۔ حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات

یہ علم ، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت ۔۔۔ پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس ۔۔۔ کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات

جو قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم ۔۔۔ حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت ۔۔۔ احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

نئے نظام تعلیم میں ذہن و قلب، خبر و نظر، عقل و عشق اور جسم و جان پر عدم توازن اقبال کو بہت کھٹکتا ہے وہ ان میں توازن و توافق پیدا کرانا چاہتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ مغرب عقل کے ساتھ عشق کو بھی اپنا رہنما بنائے۔ مغرب کی خرابی یہ ہے کہ اس نے اپنے نظام تعلیم سے اخلاقیات کے درس اور دینی تعلیم کو یکسر خارج کر دیا ہے اور جدید تعلیم مسلمان نوجوانوں کو دین و مذہب سے بے گانہ کر رہی ہے۔ موجودہ تعلیم سے جو الحاد

پھیل رہا ہے ڈاکٹر صاحب اس سے بے زار نظر آتے ہیں تعلیم ایک اجتماعی چیز ہے جس کا مقصد انتشار پیدا کرنا نہیں بلکہ اتحاد و اتفاق پیدا کرتا ہے اور انسان کو جہد مسلسل اور علم پیہم پر اکساتا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک عمل کا جوش و جذبہ صرف مذہب سے ہی پیدا ہو سکتا ہے موجودہ نظام تعلیم مسلمانوں کی قومی اور تاریخی زندگی سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا اور ان میں وہ جوش اور ولولہ سچائی اور بلند کرداری پیدا نہیں کرتا جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا وصف تھا بلکہ یہ تعلیم نوجوانوں کو روز بروز الحاد کی جانب مائل کر رہی ہے چنانچہ اس تعلیم سے بیزاری کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

انگریزی نظام تعلیم سراسر مادیت پر مبنی ہے جبکہ ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی روحانی اقدار کے وسیلے سے ہوتی ہے۔ جدید انگریزی تعلیم مسلمان نوجوانوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر کے ان کے دینی عقائد کو متزلزل کر رہی ہے اور نوجوان عشق و یقین سے بے بہرہ ہوتے جا رہے ہیں۔ مغرب کی اندھی تقلید نے ان سے ان کا نصب العین چھین کر اندھیروں میں بھٹکنے کیلئے چھوڑ دیا ہے مسلمان نوجوان اپنی تاریخ و روایات سے بے گانہ ہو کر مغربی طرز معاشرت، رفتار و گفتار کے دلدادہ نظر آتے ہیں ان میں احساس کمتری اور احساس مرعوبیت بڑھتا جا رہا ہے اور یوں قوم فکر و عمل سے عاری ہو رہی ہے۔ نوجوان تعلیم کا مقصد محض بہتر ذریعہ معاش ہی سمجھتا ہے اور موجودہ تعلیم حاصل کر کے نوجوان حلال و حرام، جائز و ناجائز کی تمیز کئے بغیر سیم و زر کے حصول کو ہی مقصد زیست قرار دیتا ہے زندگی کا مادی نقطہ نظر اور سیکولر علوم و فن سے جو نئی نسل پیدا ہو رہی ہے وہ نہ تو دین و مذہب پر قائم نظر آتی ہے اور نہ ہی اس میں یورپین اقوام کی سی خصوصیات پیدا ہو رہی ہیں۔ اقبال کا یہ نقطہ نظر مندرجہ ذیل اشعار میں کھل کر سامنے آتا ہے۔

یہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں نہ ادائے کافرانہ نہ تراش آذرانہ

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے قبض کی روح تیری دے کے تجھے فکر معاش
اس جنون نے تجھے تعلیم سے بیگانہ کیا جو کہتا یہ تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

گلہ تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا　　کہاں سے آئے صدا لاالہ الا اللہ

اور یہ اہل کلیسہ کا نظام تعلیم　　ایک سازش ہے فقط دین ومروت کے خلاف

مدرسہ اور اہل مدرسہ یا موجودہ تعلیم پر طنز وتنقید کا مطلب یہ نہیں کہ علامہ اقبال علم وفن کی اہمیت اور اساتذہ کی اہلیت وافادیت کے قائل نہیں تھے وہ خود درس وتدریس سے وابستہ رہے تھے اور شراب علم کی لذت حاصل کرنے کے لئے ہی انہوں نے مشرق سے مغرب تک کا سفر کیا تھا مگر استاد جو معمار قوم ہے اور جس کی رہنمائی روح انسانی کو منور کردیتی ہے اپنے فرائض سے کوتاہی برت رہا ہے اور تقلید ومحکومی کے باعث اس کا ذوق تحقیق زوال پذیر ہورہا ہے وہ اپنے طالب علموں کی خودی بیدار کرنے اور انہیں عشق کی جرات اندانہ بخشنے کے بجائے یورپ کے دام تزویر میں پھنسا رہا ہے اور خود اس کی نگاہیں دوربین اور دوررس نہیں ہیں ہماری درس گاہیں دانش وحکمت کی راہ تو کھول دیتی ہیں مگر زندگی کے راز سے آشنا نہیں کرتیں اہل دانش کو اہل نظر نہیں بناتیں اور سوز دماغ سے آگے بڑھ کر سوز جگر سے آشنا نہیں کرتیں چنانچہ فرماتے ہیں:

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے　　زندگی سوز جگر ہے علم ہے سوز دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے　　ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر　　کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں　　کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

علامہ اقبال چاہتے ہیں کہ مسلمان نام نہاد لادینی یا الحادی چنگل سے آزاد ہوں مغربی نظام تعلیم کی اندھادھند تقلید کرنے کے بجائے اپنے نظام تعلیم کو قرآنی آیات کے مطابق استوار کریں۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اقبال کو حکومت افغانستان کو تعلیمی امور میں مشورہ دینے کی خاطر کابل پہنچنا تھا اس سے دو دن قبل انہوں نے اپنے ایک بیان میں فرمایا ''مسلم ممالک کو اپنی قومی ضروریات کے تحت تعلیمی پالیسیاں بنانا چاہئیں سیکولر یا لادین نظام تعلیم مسلمانوں کیلئے بالخصوص کبھی مفید نہیں ہوسکتے'' مغرب نے الحاد ولادینیت کو گلے لگالیا تو اقبال ۱۹۳۲ء میں پروفیسر خالد خلیل (استنبول یونیورسٹی) کو اس کے مضمرات کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور دوسری عالمی جنگ کی برملا پیشن گوئی کرتے ہیں۔

''مذہب قوم میں ایک متوازن سیرت پیدا کرتا ہے جو حیات ملی کے مختلف پہلوؤں کے لئے بیش بہا

ترین سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔بحیثیت مجموعی یورپ نے اپنے باشندوں کی تعلیم وتربیت میں سے مذہب کا عنصر حذف کر دیا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کی بے لگام انسانیت کا کیا حشر ہوگا۔شاہد ایک نئی جنگ کی صورت میں وہ اپنی ہلاکت کا باعث خود ہو''

اقبال کی دور بین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ سیکولر علوم وفنون کی ترقی انسان کی تباہی کا باعث بنے گی۔ بیسویں صدی کی دُو عالمی جنگیں اس لحاظ سے قابل عبرت حوالہ ہیں۔ایسی تباہ کاریوں نے سائنسی علم کو''علم غیر نافع'' بنا کر رکھ دیا ہے اور موجودہ علم انسانیت کی بقاء کے بجائے انسانیت کو فنا کرنے کے درپے نظر آتا ہے۔ خصوصاً موجودہ صدی میں ترقی یافتہ اقوام اپنی علمی ترقی کے باعث متکبر ومغرور نظر آتی ہیں دوسروں کے ملک ومال پر غاصبانہ تصرف کی کوشش،توسیع پسند حکمت عملی، کمزور قوموں کو غلام بنانے کی آرزو، اپنے بہیمانہ ومذموم مقاصد کے حصول کے لئے انسانی خون سے ہولی کھیلنا انکا شیوہ بن گیا ہے۔

خواجہ غلام السیدین مرحوم نے''اقبال کا فلسفہ تعلیم'' میں اپنے نام اقبال کا ایک اردو خط مع ترجمہ نقل کیا ہے۔جس میں اقبال اپنے جاوید نامے کے حوالے سے''علم کے اسلامیانے'' کا درس دیتے ہیں۔علم کو ''اسلامیانے'' کا تصور ایک ترک مفکر محمد سعید حلیم پاشا (۱۸۶۳۔۱۹۲۱ء) نے اپنے ایک کتابچے''اسلام لشمق'' اور ایک مقالے''مسلم معاشرے کی اصلاح'' میں پیش کیا تھا اس کتابچے اور مقالے کے تاثرات اقبال کے ہاں تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (خطبۂ ششم) اور''جاوید نامہ'' فلک عطارد میں دیکھے جا سکتے ہیں۔پاشا مرحوم مغربی علم ودانش کے سیکولر یا لادین بنانے کی روش کے مقابلے میں''علم کو اسلامیانے'' کی اصطلاح لائے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ دینی وروحانی نقطۂ نظر توحید، وحدت انسانی، عظمت آدم رواداری اور عالمی اخوت کا دور دورہ ہو۔علم انسانیت کی خدمت وبقاء کا ضمن ہو۔ان کے نزدیک''اسلام لشمق''یعنی ملک وحکومت کو صحیح معنوں میں''اسلامی بنانا'' تھا۔علامہ اقبال کو ان کے نظریئے نے متاثر کیا اسی لئے اقبال علمی الحاد اور لادینی نقطۂ نظر یعنی دین یا دنیا کی تفریق کے بے حد خلاف تھے انہوں نے اپنے انگریزی خطبات اور منظوم کتابوں میں یورپ کے متاخر مفکرین اور مصنفین جیسے ڈارون، فرائیڈ اور کارل مارکس پر انتقادات لکھے اور مسلمانوں کو برملا تلقین کی کہ وہ یورپ کے نظام تعلیم کی اندھا دھند تقلید نہ کریں بے عشق یعنی ملحدانہ اور لادینانہ علم طاغوت کے مشابہ ہے یا ابو لہب کے اسے''اسلامیانے'' سے لاہوتی اور حیدر کراری بنانے سے عبارت ہو۔

مثنوی''پس چہ باید کرد'' میں اقبال الحاد آمیز اور لادینی علوم وفنون کو حکمت فرعونی کا ایک شعبہ قرار

دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

حکمتے از بند دین آزادہء ازمقام شوق دور افتادہٗ

می شوددرعلم وفن صاحب نظر از وجود خود نگردد باخبر

شیوہ تہذیب نو آدم دری است پردہ آدم دری سوداگری است

ایں نبوک، ایں فکر چالاک یہود نور حق از سینہ آدم ربود

تا تہہ و بالا نگرد و ایں نظام دانش تہذیب و دیں سودائے خام

اقبال اس مثنوی میں اقوام مشرقی وایشیائی سے مخاطب ہیں وہ یہاں مشرقی ممالک کو صنعتی اور علمی اعتبار سے اپنے پاوں پر کھڑا ہونے کا مشورہ دیتے ہیں اور چالاک یہود اور مغربی استعمار کے خلاف ایک ہمہ گیر جہاد کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مشرق ایک عظیم اور قابل رشک خطہ زمین تھا مگر مغربی اقوام نے ساری دنیا کی طرح اسے بھی تاراج کر رکھا ہے اقوام ایشیائی کو چاہیے کہ وہ مغرب کے حقیقی چہرے کو تاکیں اور اپنے اتحاد و اتفاق کی قوت سے اس سے دست کش اور بے نیاز ہوں وہ اقوام مشرق کو فوجی لادین تہذیب کا جادو توڑنے اور علوم وفنون میں مشرقیت کی روح پھونکنے کی تاکید کرتے ہیں کیونکہ مغربی انسان کی عقل وفکر خوب وزشت کے معیاروں سے بے نیاز ہے اس کی آنکھ بے نم ہے اور دل پتھر اور اینٹ کی طرح کا، سائنس اور علم شہر ودشت میں اس کے ہاتھوں رسوا ہیں مغربی علوم شمشیر کندھے پر اٹھائے نوع انسانی کی ہلاکت وتابودی کیلئے سخت کوشاں نظر آتے ہیں۔

مغرب کے ساحرا اپنی تہذیب وترقی اور علوم وفنون کی جگمگاہٹ سے اقبال کی نظروں کو خیرہ نہ کر سکے اور وہ کہہ اٹھے۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہٗ دانش فرنگ سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ ونجف

گویا دنیا کو قرآن پاک جو علم کی اساس ہے اس کی تعلیمات سے مغربی فکر کا دھارا حقائق کی طرف موڑنا چاہتے ہیں موجودہ صدی میں علم غیر نافع کے ہاتھوں انسانیت کی جو تباہی وبربادی ہو رہی ہے علامہ اقبال نے برسوں پہلے اس کی پیشن گوئی کر دی تھی اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ مشرق ومغرب علم کو انسانیت کی بقاء اور فلاح و بہبود کے لئے کام میں لائیں اور مسلمانوں کیلئے پیغام یہی ہے کہ وہ اپنے نظام تعلیم اور طریقہ تدریس میں مغرب کی کامل تقلید و پیروی کے بجائے تجدید واجتہاد سے کام لیں خود کو غلامانہ ذہنیت سے آزاد

کریں اور ملی حریت پسندی کے شایان شان اپنی درگاہوں کے لئے نصاب تعلیم مرتب کریں اس نصاب کے رہنما اصول، قرآن اور رسالت سے ماخوذ ہوں اگر چہ انہیں مغربی فکر اور علم سے کسی حد تک کوئی تعصب معلوم نہیں ہوتا وہ ان کی ترقی کا راز علم وفن کی ترقی میں بتاتے ہیں یعنی۔

قوت افرنگ از علم وفن است　　　　از ہمیں آتش چراغش روشن است

اقبال چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے دینی نظام فکر کی روح ابدی کو دل کی گہرائیوں میں بسا لیں اور روحانی بالیدگی سے اپنے قلب ونظر کو اس طرح منور کرلیں کہ یورپ کی مادی اور عقلی تعلیم انہیں گمراہ نہ کر سکے۔ اسی لئے فرماتے ہیں۔

جوہر میں ہو لا الہ تو کیا خوف　　　　تعلیم ہو گو فرنگیانہ
شاخ گل پر چہک ولیکن　　　　کر اپنی خودی میں آشیانہ

ڈاکٹر عطش درّانی

اردو کی بنیادی لسانی خصوصیات☆

یہ طے ہے کہ اردو ایک اجتماعی تہذیبی، ملی جلی اور رابطہ کی زبان ہے لیکن کیا یہ کسی خاص نسلی گروہ کی عرف عام میں ''مادری زبان'' ہے جبکہ یہ برعظیم پاک وہند میں تہذیب کی پیداوار ہے جو بنیادی طور پر مقامی بولیوں کے اشتراک سے نکھر کر عربی فارسی کے اثرات سے وجود میں آئی تھی۔ چنانچہ اسے بولی ٹھولی سمجھنے اور اسے لوک بولی سے پروان چڑھنے والی زبان سمجھنے کی غلطی ہوتی رہی ہے۔ اردو کے سلسلے میں لسانی بحثیں آج تک موضوعی انداز سے ہوتی رہی ہیں۔ دور جدید میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی ان مباحث کو رد کر کے ہمیں معروضی اور تکنیکی امور کی طرف لانا چاہتی ہے۔ کیا ہم اس کیلئے مناسب تیاری کر رہے ہیں؟

اردو کے حوالے سے ایک خلط مبحث مردم شماری کے طریقوں سے بھی پیدا ہوتا ہے جو مقامی زبان بولنے والوں کے حوالے سے ایک خاص طرز کے اردو بولنے والے افراد کا تعین کرتے ہیں اور یوں اردو بولنے والوں کی تعداد کو کم ظاہر کرتے ہیں۔ یوں پاکستان میں اردو اقلیت کی زبان بن کر رہ جاتی ہے۔ صورتحال یہ ہے کہ اردو تہذیب کی پیداوار اور ایک شہری زبان ہے۔ اسے عام بولی یا لوک بولی سے ترقی یافتہ سمجھنا اور اس کے مقامی بولنے والے افراد کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ اکثر اردو بولنے اور استعمال کرنے والوں کی کوئی نہ کوئی اپنی زبان یا بولی ضرور ہوتی ہے۔ یعنی وہ ذولسانی ہوتے ہیں۔ وہ خاص طور پر اردو بولتے ہیں۔ اپنی ابتداء کے ساتھ ہی اردو ایک خاص زبان ٹھہری ہے۔ رفتہ رفتہ عوام بھی اس سے متاثر ہوتے چلے گئے اور اس میں نظم ونثر کا عظیم سرمایہ ادب پیدا ہوتا چلا گیا کہ اب اسے دنیا کی بڑی زبانوں کے مقابلے پر رکھا جا سکتا ہے۔

اردو کی جنم کہانی خاصی دلچسپ، پیچیدہ اور مبہم ہے۔ اس لحاظ سے بھی اردو کی بنیادی لسانی خصوصیات کا تعین خاصا پیچیدہ امر ہے۔ بعض کے نزدیک اردو لشکری زبان ہے اور کسی لشکر کے اندر پیدا ہوئی بعض اسے دہلی کی پیداوار یا اس کے اردگرد کی کھڑی بولی یا شورسینی پراکرت یا اُپ بھرنش یا پنجابی، لاہوری، ملتانی، سندھی، سرائیکی، دکھنی، ہندکو کی ترقی یافتہ شکل قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک اردو زبان مسلمانوں کے

☆ زیر نظر مضمون میں اردو کے لسانی ارتقاء اور تشکیلی تعینات کے بارے میں مصنف کے نقطہ ہائے نظر سے ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں۔

زیر اثر پروان چڑھی اور یہ برعظیم پاک و ہند کی تمام زبانوں کی زبان یا لسان الالسنہ ہے۔ اسی بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس میں یونانی پرتگالی، ہسپانوی، ولندیزی، اطالوی، فرانسیسی اور انگریزی سے لے کر عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، پالی، دراوڑی وغیرہ سب زبانوں اور بولیوں کی آمیزش ہے اور اس کی ساخت ایسی ہے کہ ہر زبان کے الفاظ کو با آسانی شامل کر لیتی ہے۔ یہ ایک لسانی کلیت ہے۔ اس لئے اسے ''لسان الارض'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی کیا لسانی کلیت کوئی چیز ہوتی ہے؟ کیا جہاں تک اردو کے مزاج کا تعلق ہے یہ اتنی امتزاجی ہے کہ اسے دوسری زبانوں کو اپنانے کیلئے تیار کرنے یا اردو دانی کا [illegible] نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے قواعد بے حد مختصر اور اسے سیکھنا بہت آسان ہے۔ یہی بات ہمیں اردو کی اس پہلی لسانی خصوصیت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

چونکہ اردو بنیادی طور پر ایک لوک بولی نہیں ہے اس لئے اس کے حروف تہجی کا تعلق اصوات سے نہیں بلکہ روایت سے ہے۔ یوں ہم لسانیات کے عمومی صوتیاتی قاعدوں سے اس کا جائزہ نہیں لے سکتے۔ مثلاً ''a'' کی آواز اردو میں ''ا، ع، ء'' کی صورت میں، ''t'' کی آواز ''ت، ۃ، تھ، ط، ٹھ'' کی صورت میں ''h'' کی آواز ''ح، ہ'' کی صورت میں، ''z'' کی آواز ''ذ، ز، ض، ظ'' کی صورت میں، ''s'' کی آواز ''ث، س، ص'' اور ''y'' کی آواز ''ژ، ی'' کی صورت میں ادا ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ...... ''اردو کے یہ حروف تہجی عربی، فارسی میں ہندی اور مقامی آوازوں کے شمول سے پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے کہ جن الفاظ میں ''ق''، ''ض'' وغیرہ کے حروف ہوں گے وہ لازماً عربی کے ہوں گے اور جن میں ''ژ'' کا املا ہو گا وہ لازماً فارسی کے ہوں گے۔ اسی طرح ''ٹ، ڈ، ڑ'' کے حروف رکھنے والے الفاظ لازماً ہندی ہوں گے''..... دراصل اردو نے دیگر زبانوں سے جب یہ حروف لئے تو ان کا استعمال صرف اپنے لئے مخصوص رکھا۔

یوں ''تراق پڑاق''، ''صابن''، ''رضائی''، ''وژن'' جیسے الفاظ وجود میں آئے جو اردو کے اپنے الفاظ ہیں کہ ان کے املا کے لئے ''ق، ص، ض، ژ'' وغیرہ کو استعمال کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس لحاظ سے ہمیں اردو اصوات اور حروف کا تقابل کسی اور انداز سے کر کے دیکھنا ہو گا، روایتی اور لسانیاتی انداز سے نہیں۔ مثلاً

۱۔ اردو میں حروف صحیح کی تعداد معین نہیں بلکہ روز افزوں ہے لیکن یہ سب اس کے اپنے حروف ہیں۔

۲۔ اردو کے تمام حروف صحیح (Consonant) ہیں سوائے ''الف''، ''و'' اور ''ی''، ''ے'' کے جو اس کے ساتھ حروف علت (Vowel) بھی ہیں۔ بعض لوگ نون غنہ ''ں'' کو بھی علت مانتے ہیں۔ کیا ہم اسے حرف کی خصوصیت سمجھیں گے یا اصوات کی املا کی مجبوری؟

۳۔ اصوات علت ''الف، و، ی، ے'' کے علاوہ زبر، زیر، پیش اور ہائے مختفی (ہ) کی صورت میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یوں اردو میں اعراب کے بجائے ہم انہیں حرکات (زبر، زیر، پیش) کہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ہائے مختفی بھی علت قرار پائے گی۔ خواہ نیم علت ہی کیوں نہ ہو۔

۴۔ اردو میں ''الف، و، ی، ے'' کی ایک تیسری صورت بھی استعمال ہوتی ہے جسے حرف مخلوط یا ملواں حرف کہا جاتا ہے۔ اس کے اظہار کیلئے جزم یا الٹے چاند کی علامت استعمال کی جانی چاہیے کیونکہ جزم کی علامت کا اردو میں کوئی اور استعمال اضافی ہے۔

۵۔ کھڑے زبر اور کھڑے زیر صرف عربی الفاظ کے استعمال میں آتے ہیں۔ بعض مخصوص الفاظ ان سے لکھے جاتے ہیں بصورت دیگر انہیں ''الف'' اور ''ی'' میں بدلا جاتا ہے۔ کیا ہمیں ہمت کر کے انجمن ترقی اردو کا فیصلہ لاگو نہیں کر لینا چاہیے کہ اردو سے کھڑے زبر زیر عموماً ختم کر دیئے جائیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو اردو میں مندرجہ ذیل ملتی جلتی اصوات اور ان کے حروف وجود میں آتے ہیں۔

ا، ع، ء، آ، اٰ

''a'' کی ابتدائی اور آخری یعنی صحیح اور علت کی آواز یا صوت کو ''الف'' سے ظاہر کیا جاتا ہے اس کی متحرک صورت جو بیک وقت صحیح اور علت ہوتی ہے جیسے ''تأمل'' اور ''جرأت'' ''تیز'' ''کئ'' اور ''گئے'' میں آتی ہے اسے ہمزہ ''ء'' کا نام دیا گیا ہے۔ ''آ'' کو اردو میں دو الف یعنی الف صحیح + الف علت قرار دینا غلط ہے۔

یہ a کی آواز ہے اور اب یہ اردو کا ایک جدا حرف ہے جو شروع میں آتا ہے۔ جیسے ''آب، آگ'' میں اس کی علت کی صورت میں ''ا'' کے انداز میں لکھی جاتی ہے۔ اسے فعل امر کے الفاظ سنا، دکھا، ملا میں بھی لکھنا چاہیے۔ کھڑے زبر ''اٰ'' اور کھڑے زیر ''اٖ'' کا اُردو سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ یہ صرف عربی الفاظ میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور انہی کے لئے اُردو املا میں ان کا التزام ہوتا ہے۔ البتہ آہستہ آہستہ اب اردو میں انہیں مکمل صورت میں لکھا جا رہا ہے جیسے کھڑے زبر والے الفاظ کو ماجرا، مقتدا، ہیولا، دعوا، مدعا، معرا، مولا وغیرہ۔ انجمن ترقی اردو نے واضح طور پر فیصلہ دیا ہے کہ عربی الفاظ میں الف مقصورہ (کھڑا زبر) پورا الف لکھا جائے۔ مقتدرہ قومی زبان کی سفارشات میں بھی اسی پر زور دیا گیا ہے اور اس کی تدریس اردو کے حوالے سے نہیں کرنی چاہیے۔ اسی طرح تنوین بھی خالص عربی الفاظ کا املا ہے تو کیا تنوین اردو قاعدے میں با قاعدہ شامل سمجھی جائے۔

الف کی ایک آواز ہائے مختفی میں آتی ہے۔ جیسے کعبہ، شگفتہ، خانہ وغیرہ۔ بقول ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اردو میں ہائے مختفی کا وجود نہیں۔ یہ فارسی کی چیز ہے۔ ایسے الفاظ کو بھی الف سے لکھنا چاہیئے۔ خاص طور

پر مقامی الفاظ ''ہ'' سے نہ لکھے جائیں۔ جیسے بھروسا، پتا، سامنا، دھوکا، کلیجا، مہینا، ٹھیکا وغیرہ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو میں ہائے مختفی کا وجود نظر آتا ہے۔ خاص طور پر شمالی مغربی پاکستان میں کیونکہ یہ ان الفاظ میں آتی ہے جہاں آخر میں ''a'' کی آواز زبر کے دباؤ کو ظاہر نہیں کرتی بلکہ اس سے قدرے زیادہ اور الف سے قدرے کم مگر زوردار محسوس ہوتی ہے۔ بعض مقامی اور ہندی الفاظ بھی ہائے مختفی کو ظاہر کرتے ہیں جیسے ستیہ، راشٹریہ، مدھیہ وغیرہ۔ اسی طرح فارسی الفاظ پیمہ وغیرہ۔ اس لئے ہائے مختفی والے الفاظ کو ''ہ'' ہی سے لکھا جانا چاہیے۔ ہائے مختفی سے پہلے البتہ زبر کی حرکت دینا لازم نہیں بلکہ زائد ہے۔

الف مخلوط کی آواز ''تیرانداز، شیرافگن، بالکل'' وغیرہ میں محسوس ہوتی ہے۔ یعنی الف لکھا تو جاتا ہے لیکن بولا نہیں جاتا اور اس سے پچھلے اور اگلے حروف آپس میں مل جاتے ہیں جیسے تیرانداز، شیرافگن، بالکل'' وغیرہ

ہمزہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک بطور حرف (مثلاً آئینہ، گئے، سائل، بائبل'' وغیرہ میں) اور دوسرا بطور علامت اضافت (مثلاً نغمۂ دل اور جلوۂ طور ہیں) بقول حسن خاں ہمزہ کو اردو کا حرف ماننا چاہیئے۔ عربی میں یہ حروف تہجی کے شروع میں الف کا قائم مقام ہے لیکن اردو میں ''ہ'' کے بعد آتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک صورت ہے جو ''ؤ'' اور ''ی'' کی آواز کو کھینچتی ہے۔ جیسے ''کئی، گئے، آؤ، گئے'' وغیرہ میں۔ اردو نے اسے ''رائفل، بائبل'' جیسے الفاظ لکھنے کیلئے استعمال کیا ہے۔ اسی طرح ''آئینہ، آئین، لکھنؤ، کماؤ، لاؤ، لائے'' میں بھی استعمال کیا جاتا ہے لیکن ''لئے، دیئے، پیئے،، میں ہمزہ کا استعمال غلط ہے۔ انگریزی الفاظ کے املا میں اس کا استعمال البتہ جائز ہے جیسے سائنس، ٹائپ، لائبریری، ڈائریکٹر، سائز وغیرہ۔ اس لحاظ سے اب ہمزہ اردو کا حرف ٹھہرتا ہے۔

عین ایک مخصوص عربی حرف ہے جو زیادہ تر عربی الفاظ ہی کے لئے اردو میں آتا ہے۔ یہ اردو کی کسی صورت کو ظاہر نہیں کرتا لیکن اس کا وجود روایتی طور پر قائم ہے۔ اردو میں ہزاروں الفاظ عین کے املا سے موجود ہیں۔ ماہرین لسانیات نے اسے الف سے الگ صوت تسلیم تو کیا ہے اور رومن میں اسے ''a'' کے بجائے الٹے کامے ''،'' سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کی صوتی صورت یا صورتیہ معلوم نہیں کر سکے۔

و (واؤ)

حروف صحیح میں w کی آواز دینے کے علاوہ یہ حرف ''واؤ'' بطور علت دیگر کئی اصوات کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض الفاظ میں صرف املا موجود ہے۔ تاہم بطور حرف علت ''o'' کی آواز دیتا ہے جیسے ''دو، لو

ہو'' میں۔ بعض فارسی الفاظ میں اسے لکھا جاتا ہے لیکن آواز نہیں آتی جیسے ''خود، خوش، خویش، خور'' میں۔ اسے واؤ معدولہ کہتے ہیں۔ لیکن اگر واؤ کے بعد الف آ جائے تو اس کی آواز ''ua'' کو ظاہر کرتی ہے جیسے خواب، خوابِ، خوار، خواست، خواہش، خواہ، خوان وغیرہ میں۔ یہ صوت بعض ہندی پنجابی الفاظ مثلاً پھوار، چھوار، دھواں، کنواں وغیرہ میں بھی ہے۔ پیش کے ہمراہ اس کی مجہول صورت ''oo'' ظاہر کرتی ہے جیسے ڈور، چور، گھور وغیرہ میں۔

ت، ۃ، ط

تائے مدورہ یا گول ''ۃ'' صرف بعض عربی املا کے الفاظ میں آتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اسے بھی ''ت'' سے لکھا جائے جیسے زکات، صلات، وغیرہ لیکن اگر کوئی ''زکوۃ، صلوۃ'' پر مصر ہو تو اس پر بھی اعتراض نہیں کرنا چاہیے البتہ ''قرۃ، عادۃ اور فطرۃ میں اس کا استعمال استثنائی حالت کے طور پر جائز ہے۔ تو کیا تائے مدورہ یا گول ''ۃ'' کو اردو کے حروف تہجی میں شامل نہ سمجھا جائے خواہ یہ استثنائی حالت ہی میں ہو۔ اردو میں گول ۃ کے استعمال کے لئے صرف یہی چار پانچ الفاظ بہت ہیں۔ ترقیے کی صورت میں بھی ''ۃ'' مرکبات میں استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً کعبۃ اللہ، رحمۃ اللہ وغیرہ میں۔ اس لئے ''ۃ'' کو بھی اردو حرف سمجھا جائے۔

''ط'' عربی لفظ ہے۔ لیکن ت سے زیادہ گہری آواز کیلئے ہے۔ بعض فارسی الفاظ مثلاً طشت، طباشیر، طوطا، طمانچہ وغیرہ بھی ''ط'' سے لکھے جاتے ہیں جو اصلاً ''ت'' سے ہیں لیکن انہیں ت سے لکھنا غلط ٹھہرے گا۔ اسی طرح گویا ''ط'' اردو کا بھی ایک الگ اور منفرد حرف ہے۔

ث، س، ص

''ث'' عربی میں th کی آواز ذرا ملائم اور نرم کر کے بولنے کیلئے استعمال ہوتا ہے بعض اردو الفاظ مثلاً میراثی، مثل (File) (صحیح ''مسل'' ہے) وغیرہ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ''ص'' بھی خالص عربی حرف ہے اور ''س'' کی گول انداز کی آواز کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن بعض فارسی الفاظ مثلاً صد، صدا'' وغیرہ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح ان حروف کی جداگانہ روایتی حرفی حیثیت مسلم ہے۔

ذ، ز، ظ

ذال ''ذ'' خالص عربی حرف ہے۔ عام طور پر اسے ''ز'' کے ذیل میں بھی بعض الفاظ کے املا میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ البتہ فارسی میں ''آذر'' (مہینے کا نام) اور اردو میں ''ذرا'' جیسے الفاظ ''ذ'' ہی سے لکھے

جاتے ہیں۔ تو کیا ''گزر، گزارش'' کو ''ذ'' سے لکھنا غلط ہے۔ کیا ہم عام طور پر ایسا کر کے عربی فارسی ماخذ کا لحاظ رکھنے پر مجبور رہیں گے؟ ''ض'' بھی خالص عربی حرف ہے لیکن بعض اردو الفاظ مثلاً ''رضائی'' اسی سے لکھے جاتے ہیں۔ ایک لفظ ''غیظ'' بھی غلط طور پر ''غیض'' لکھا جاتا ہے۔ ''ظ'' صرف عربی الفاظ میں استعمال ہوتا ہے مگر کیا عام لوگوں کو اس بات کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ کون سا لفظ عربی ہے اور کون سا نہیں۔ کیا یہ ان کے حافظے پر اضافی بوجھ نہ ہوگا۔

ژ، ی، یھ

اردو میں ''ژ'' خالص فارسی ہی نہیں بعض انگریزی اور فرانسیسی اصوات کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے اور وہ الفاظ ''ی'' کی صحیح یا معروف آواز یا صوت سے ظاہر نہیں کئے جا سکتے۔ مثلاً فارسی میں ''مژہ''، ''ژولیدہ''، ''اژدہا''، ''پژمردہ''، ''ژرف''، ''نژاد'' وغیرہ کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی الفاظ ''بوژوا، ٹیلی ویژن، آندرے ژید، آ ژی'' وغیرہ میں بھی استعمال ہونے سے اسے اب اردو ہی کا ایک حرف سمجھنا چاہیے جو صوت ''dz'' کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسے ایک اور صورت ''یھ'' میں لکھا جاتا رہا ہے۔ کیا ''یھ'' کی آواز ''ژ'' کی قائم مقام ہے۔ اس بات کا بھی کوئی واضح جواب موجود نہیں۔ بعض الفاظ میں ''ی'' لکھی تو جاتی ہے لیکن مخلوط بولی جاتی ہے۔ جیسے ''لیا، دیا، سیا، لیے، دیئے'' وغیرہ میں۔ ان میں ''ی'' حرف صحیح اور علت دونوں صورتیں ادا کرتا ہے اسے یائے مخلوط کہتے ہیں۔ اس کی آواز نسبتاً ہمزہ لیکن قدرے ''ی'' پر زبر کے ہلکے سے جھٹکے سے آتی ہے۔

ک، ق

''ق'' خالص عربی حرف سمجھا جاتا ہے لیکن اردو املا کے بعض الفاظ ''قسائی، تڑاق، پڑاق، ترقانا، ترقنا، زنبق، بھنبھق'' کسی اور طرح سے ظاہر کئے ہی نہیں جا سکتے۔ اس لئے ''ق'' اب اردو ہی کا حرف شمار ہوگا۔

ن۔ ں۔ ڹ وغیرہ

حرف ''ن'' کے عام استعمال کے علاوہ ایسے الفاظ بھی ہیں جن میں ''ن'' لکھا تو جاتا ہے مگر ان کی آواز ''n'' کی نہیں ہوتی بلکہ ''m'' کی ہوتی ہے۔ مثلاً ''منبر، انبیا، سنبھل، گنبد'' وغیرہ میں یہ ''م'' کی آواز دیتا ہے بعض الفاظ میں ''نون غنہ'' ہوتا ہے جیسے ''ہاں، ماں، چاند، جانچ'' وغیرہ میں۔ بعض الفاظ میں ''نون غنہ'' نہیں بلکہ ''نون مغنونہ'' کی آواز آتی ہے جیسے ''بھانڈا، انڈا، اوندھا، اینٹھن، اینڈنا، منگیتر، بانٹ'' انہیں

بھی ''نون'' ہی سے لکھا جاتا ہے۔ اردو میں ''کرشنڑ، ڈنڑ'' وغیرہ لکھنا مشکل تھا۔ اب ہندکو حرف ڑون ''ڻ'' کی صورت میں اسے کرشڻ ڈڻ وغیرہ لکھنا بھی ممکن نہیں ہے۔

دوچشمی ھ

اردو میں بعض مقامی بھاری یا حلقومی آوازیں بھی مستعمل ہیں۔ عرصہ دراز تک ان کے حروف مقرر نہیں تھے۔ انہیں مخلوط اصوات قرار دے کر ''ہ'' کے ساتھ ملادیا جاتا تھا۔ لیکن ''بہائی'' (Bahai) اور ''بھائی'' (Bhai) میں فرق صرف سیاق وسباق ہی سے معلوم ہوسکتا ہے۔ رفتہ رفتہ دوچشمی ''ھ'' ایسی مخلوط آوازوں کیلیئے بطور علامت استعمال ہونے لگی۔ جیسے ''بھ، پھ، تھ'' وغیرہ میں۔ اسے ہائے مخلوط بھی کہا گیا۔ حقیقت میں یہ ''h'' کی صوت ہی نہیں ہے۔ اردو کی ابتداء میں ان بھاری آوازوں کو ''ہ'' سے لکھا ہی نہیں جاتا تھا بلکہ اس کے اظہار کے لئے متعلقہ حرف کے ساتھ محض چار نقطوں کا اضافہ کردیا جاتا تھا جیسے پ ٹ امیر خسرو کی ''خالق باری'' اسی میں لکھی گئی تھی۔ یہ صورت اب سندھی رسم الخط میں باقی ہے۔ بھ، پھ، تھ منفرد آوازیں ہیں، مرکب اصوات نہیں، یہ ب + ہ کی بنی ''بھ'' نہیں ہیں بلکہ ایک ہی صوت بھا ''Bh'' ہے۔ اصول یہ ٹھہرا کہ اگر کسی حرف کی کوئی بھاری آواز مستعمل ہے تو اس کے لئے دوچشمی ''ھ'' کی علامت کا اضافہ کریں گے۔

گویا اردو کے ہر حرف کی ایک ذیلی صوت دوچشمی کے ساتھ بھی ہوسکتی ہے۔ اردو کے ایک غلط العام لفظ ''یہاں'' کی اصل آواز ''یھاں'' ہے جو ''یھ'' یعنی ''ی + ھ'' سے وجود میں آتی ہے۔ صرف غلط املا کے باعث یہ متروک ہوکر ''یہاں'' کے غلط العام میں بدل گئی۔ اسی لئے ''گھما گھمی'' ''گہما گہمی'' بن گئی۔ ''لھر، بھر'' کو ''لہر بہر'' بنادیا گیا۔ ترتیب حروف میں ''ھ'' یائے معروف ''ی'' کے بعد آئے گا۔ کمپیوٹر میں ترتیب حروف اس طرح ممکن ہے۔ اس لئے اسے ''ہ'' کی دوسری املائی صورت نہ سمجھا جائے اور اس سلسلے میں عربی پر انحصار نہ کیا جائے مگر ہمارے ہاں لوگ اسے ''ہ'' کے ساتھ لکھنے پر مصر ہیں۔ ''ھ'' اردو کے کسی لفظ یا ترقیمے کے شروع میں نہیں آسکتا کیونکہ یہ ''ہ'' نہیں ہے۔ چنانچہ ''لاھور'' لکھنا غلط ہے اور ''لاہور'' لکھنا درست ہوگا۔

نون غنہ ''ں'' کی ایک بھاری صوت ''aenh'' کی ہے جو آنھ، اونھ، مینھ، مونھ، مینھدی وغیرہ میں مستعمل ہے۔ تفصیل کے لئے نسیم اللغات دیکھیے۔ اسی طرح ایک صوت ''wh'' کی ہے جو وھاں، وھیل، وھائٹ میں ظاہر ہوتی ہے ایک صوت ''سھینا'' میں ''سھ'' اور ''شھتوت'' میں ''شھ'' کی صورت میں آتی ہے

بعض لوگ "مذہَب" "مذھَب" بھی لکھتے ہیں۔ چند پنجابی، ہندکو اور سرائیکی اصوات بھی اردو میں داخل ہونے کو ہیں انہیں بھی دوچشمی "ھ" سے ظاہر کیا جاسکتا ہے اردو میں ہندکو کی ایک آواز "eh" "اھ" سے ظاہر کی جاسکتی ہے۔ سندھی اور لاہوری کی ایک آواز "geh" "قھ" سے ظاہر کی جاسکتی ہے جیسے قھی (gehi)، قھوڑا (gehora)۔ عربی میں "v" کی تھ جیسی آواز کے لئے ث کا حرف ایجاد کرلیا گیا ہے۔ جو اردو میں "فھ" ہوسکتا ہے ان سب صورتوں میں کیا ہو؟ محض سادہ جواب کافی نہیں۔

اردو میں اب تک کی مستعملہ بھاری آوازوں کے مروجہ حروف حسب ذیل ہیں۔ یہ ترتیب حروف میں اپنے اصل حروف کے بعد یا ذیل میں آئیں گے۔

بھ، پھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ، گھ، لھ، مھ، نھ، وھ، یھ

ان میں سے رھ، لھ، مھ، نھ کیلئے "تیرھواں، گیارھواں، سرھانا، کولھو، گلھڑ، کلھاڑا، تمھارا، کمھار، انھیں، انھوں، ننھا، ننھیال، منھیاری، جیسی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

نئی امکانی بھاری آوازوں کے لئے مستقبل کے حروف مندرجہ ذیل ہوسکتے ہیں۔

"اھ، ذھ، سھ، شھ، فھ، قھ"۔

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اردو میں حروف تہجی مقرر نہیں بلکہ روز افزوں ہیں البتہ حروف املا مقرر ہیں انہی کے امتزاج سے حروف تہجی وضع کیے جاسکتے ہیں یا آئندہ وجود میں آسکتے ہیں یہ حروف املا حسب ذیل ہیں۔

ا، آ، ب، پ، ت، ج، چ، ح، خ، د، ڈ، ر، ڑ، ز، ژ، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع،

غ، ف، ق، ک، گ، ل، م، ن، ں، و، ہ، ء، ی، ھ، ے۔

اردو میں حروف املا کی بیس بنیادی شکلیں ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں انہی کے امتزاج اور نقطوں کے ملاپ سے حروف تہجی وجود میں آتے ہیں۔

اب ح د ر س ص ط ع ف ق ل م ں و ہ ء ی ے

مقتدرہ قومی زبان کی ایک کمیٹی نے ۲۶ جنوری ۲۰۰۴ کو اردو کے مندرجہ ذیل حروف تہجی کو معیار تسلیم کیا ہے تاکہ باقی بحثوں کا دروازہ اب بند ہوجائے اور اردو کمپیوٹر ٹکنالوجی کی سان پر چڑھ کر آبدار ہوجائے۔

ا، آ، ب، بھ، پ، پھ، ت، تھ، ٹ، ٹھ، ث، ج، جھ، چ، چھ، ح، خ، د، دھ، ڈ، ڈھ، ذ، ر، رھ، ڑ، ڑھ،

ز، ژ، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، کھ، گ، گھ، ل، لھ، م، مھ، ن، نھ، ں، نھ، و، وھ، ہ، ۃ، ء، ی، یھ۔

اردو میں نئے مصادر وضع کرنے کی بہت بڑی اہلیت موجود ہے جو عربی، فارسی، انگریزی، کو حاصل نہیں لاحقہ مصدری یا علامت "نا" لگا کر جتنے مصادر چاہے بنالیں اسی طرح "کرنا" یا "ہونا" لگا کر جتنے چاہے مرکب مصادر بنا لیجیے اسی طرح "کرنا" یا "ہونا" لگا کر جتنے چاہے مرکب مصادر بنا لیجیے سب درست ہوں گے۔ جیسے!

"برقانا، فلمانا، قلمانا، وصولنا، نوازنا، بدلنا، بخشنا، شرمانا، گرمانا، خریدنا، تراشنا، بخشنا، قبولنا، پریکٹس کرنا، آف کرنا، آن کرنا، بور ہونا، وغیرہ۔

اردو میں مرکب سازی کی خصوصیت بہت مستحکم ہے اب یہ لازم نہیں کہ مرکب کے تمام اجزاء بھی فارسی ہوں یا صرف ہندی اور مقامی ہوں ایک زمانہ تھا کہ ایسے مرکبات کو غیر فصیح سمجھا جاتا تھا مگر اب یہ عام استعمال میں ہیں۔ جیسے:

"تھانے دار، کھٹکے دار، اگال دان، چوکی دار، دھنگا مشتی، کٹ حجتی، غل غپاڑہ، گرانڈیل، برلب سڑک، لاپتا، بےفکرا، چال باز، میل خورا، نیک چلن، وغیرہ۔

اگرچہ اردو میں تارید کا عمل بہت کم ہوتا ہے تاہم بعض الفاظ ایسے طریقے سے اردوائے گئے ہیں کہ اب اردو ہی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے:

"دراز، الماری، کارتوس، بالٹی، صابن، فراش، چابی، گھاس، کف، کالر، کنستر، بٹن، اردلی" حتیٰ کہ "بوریت" جیسی اختراعات بھی موجود ہیں۔

اردو میں سابقے لاحقے دنیا کی ہر زبان سے بڑھ کر ہیں۔ ان میں "چی" جیسے ترکی لاحقے سے بھی بے شمار الفاظ بنائے گئے ہیں جیسے: "باورچی، توپچی، طبلچی، خزانچی" مونث الفاظ مثلاً "باورچن" بھی بنائے گئے ہیں۔

اردو کے جملوں میں انگریزی، عربی، فرانسیسی، الفاظ اور تراکیب کو باہم ملا کر بولا جاسکتا ہے اس میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی لیکن لکھنے میں ذرا تکلف محسوس ہوتا ہے۔ جیسے:

"میں جنرلی سپیکنگ آپ سے ایگری کرتا ہوں کہ ڈفرنس آف اوپینین کو مائنڈ نہ کریں۔"

اسے اردو میں "لسانی پراگندگی" یا "لسانی بدعت" کا نام دیا جاسکتا ہے لیکن کیا کیجیے کہ زبانیں اسی

طرح ترقی کی منزلوں کی طرف بڑھتی ہیں مستقبل کی اردو کچھ ایسی ہی بنتی نظر آرہی ہے کبھی مقامی ہندی یا قدیم پنجابی میں عربی فارسی آمیزش اسی طرح سے ہورہی تھی اب انگریزی شامل ہورہی ہے وقت خود ہی اردو زبان کا جدید رخ متعین کرے گا۔

اردو کا متن اپنے رنگ کے لحاظ سے مقامی، خصوصی، عمومی، اور عالمی نوعیت کا ہوسکتا ہے بیانیہ لحاظ سے یہ عوام اور خواص کے طرز بیان کا حامل ہوسکتا ہے کسی بھی زبان کی ساخت پیش آمدہ صورت حال، ثقافتی، تنوع اور بنیادی ضرورتوں کے حوالے سے وجود میں آتی ہے درسی ضرورتوں کے حوالے سے اردو کا لسانیاتی جائزہ معنی کے ابلاغ کا احاطہ کرتا ہے اور اس کی حیثیت سہ درجاتی ہوتی ہے:

1- تجربی 2- تفاعلی 3- متنی

متنی حیثیت بھی افعال، اسما اور احوال سے معنی کی تقسیم کرتی ہے۔ ان مقاصد کے لئے تین بنیادی اصطلاحیں سانچا (Register)، کینڈا (Genre) اور محضر (Discourse) استعمال کی جاتی ہے۔

صورت حال کے حوالے سے زبان کی مختلف انواع سانچا کہلاتی ہیں ثقافتی تنوع کے لحاظ سے انہیں کینڈا اور متنی یا تقریری ضرورتوں کے حوالے سے محضر کا نام دیا جاسکتا ہے ان سانچوں میں ہمیں معنویات (Semantics)، نشانیات (Semiotics) اور نتائجیات (Pragmatics) کا خاص طور پر دھیان رکھنا ہوگا۔ یعنی لفظ اور معنی کا رشتہ کیا ہے؟ لفظ بذات خود کیا ہے اور حقیقی الفاظ کون سے ہیں یہ تینوں علوم انہی تینوں باتوں سے متعلق ہیں اردو کے تحقیقی کاموں میں ابھی تک ان اطراف پر توجہ نہیں دی جارہی۔

لسانی ترقی کے مسائل میں اردو حروف تہجی، اس کی لسانی خصوصیات اور اس کے پاکستانی انداز کو ملحوظ رکھنا اہم ہیں خاص طور پر اردو رسم الخط کے مسائل، ہجے، واحد جمع اور تذکیر و تانیث کے طریقوں کو آسان تر بنانا لازم ہے۔ یہ سب کچھ ۱۹۷۵ء میں نوم چومسکی، ژان پیاژے اور بہت سے دوسرے ماہرین کے درمیان ایک مباحثے کے نتیجے میں ظاہر ہوا پیاژے کی سکیم سے چومسکی کی سکیم بہتر ہے۔

اردو بول چال کے سانچے بے حد کم اور محدود رہے ہیں بہت عرصے تک اردو ادبی کینڈوں سے باہر نہیں نکل سکی بازاری، عوامی، اردوئے معلی یا عورتوں کی بولی کرخنداری وغیرہ غرض یہ کہ کسی بھی سانچے کے تحریری کینڈے کا ذکر کریں۔ یہ طے ہے کہ اردو بولنے والے اردو بولی نہیں بولتے تھے بلکہ عادتاً صرف اردو بول چال کا تحریری کینڈا استعمال کرتے تھے یہی تحریری کینڈے درس و تدریس میں در آئے یہی وجہ ہے کہ "گھما گھمی" جیسے

الفاظ تحریری کینڈے کے باعث ''گھما گھی'' بن گئے۔ادبیات کی زبان بھی ادبی محضر اور اس کے مختلف تحریری کینڈوں تک محدود رہی اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو بولنے والے اپنی الگ خاندانی بولی یا زبان بھی بولتے ہیں اب وہ نسل در نسل تحصیل کے باعث عادتاً اردو بولتے ہیں بقول جیلانی کامران پاکستان بننے کے بعد اردو بول چال کے وسیع تر مواقع میسر آئے اور یوں ''بولی'' کا کینڈا وضع ہونے کے امکانات بڑھے۔ یہاں اس کا جداگانہ کا منفرد رنگ، کینڈا یا لہجہ بھی پروان چڑھا جو کلاسیکی اردو سے ممتاز ہے۔ پاکستانی اردو کی اپنی ایک الگ رنگت ہے یہ بول چال، ادبی محضر اور علمی محضروں میں بھی منفرد ہے۔

پاکستانی اردو کے بڑے ماخذ ہمارے کلاسیکی اور روایتی شعروادب مشاعروں کی روایت سماجی اور ثقافتی انداز، مقامی الفاظ، معنوں، روزمرہ، محاوروں، قواعد وانشا پردازی کے طریقوں، صوتیاتی انداز، اردو میں انگریزی کے اثرات ہیں۔ پاکستانی اردو میں دخیل انداز جیسے:

(۱) تلاش سے مصدر تلاشنا بنانا۔ (۲) معنویاتی تبدیلیاں جیسے اپناپن، پس رو، بندہ بننا۔ (۳) ترجمہ کے ذریعے سے جیسے ماہ عسل، جز وقتی، جشن سیمیں وغیرہ۔ (۴) دوغلے الفاظ کی بھرمار جیسے کھکھل دار وغیرہ کی مثالیں۔ (۵) قواعد تبدیلی جیسے ''میں نے لاھور جانا ہے'' ''ہم جائیں گی'' وغیرہ۔ (۶) اسلوبیاتی انحراف جیسے ''شب اجالنا'' ''پھنے خان'' ''خوابوں کی چاندنی'' جیسی تراکیب کا وجود میں آنا۔

معیار سے انحراف کی واضح مثالیں ہیں جو خوب مستعمل ہیں

پاکستانی اردو میں جہاں ایک طرف یہ انحرافات موجود ہیں وہیں ثقیل الفاظ واصطلاحات کی تشکیل بھی ہو رہی ہے اور نئے نئے محاورے بھی وجود میں آرہے ہیں۔ پاکستانی اردو کا یہ نکھار ۱۹۶۵ء کے بعد سامنے آیا جب پاک بھارت جنگ نے اہل وطن کو سرزمین وطن کی طرف مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا اور اہل قلم نے کلاسیکی انداز کو خیرباد کہہ کر حب الوطنی کے جوش میں تخلیقات پیش کیں۔ ۱۹۷۱ء میں سقوط مشرقی پاکستان کے بعد سے انگریزی کے اثرات بڑھنے لگے جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے سے بھی بڑھ کر ''انگریزی آمیزی''، ''انگریزی افعال میں اردو کا استعمال'' اور ''عربی فارسی سے گریز'' کی طرف چلا گیا۔

جمع کے صیغے بدلے تذکیر وتانیث کے انداز بدلے۔معیار بدلا جسے انشاء اللہ خان انشا نے اپنی کتاب ''دریائے لطافت'' میں غیر فصیح کہا وہی کینڈا اب پاکستانی اردو کا معیار ٹھہرا ہے اردو کے معیاروں کی بات کریں تو بقول شان الحق حقی اس سوال کا تشفی آمیز جواب ابھی باقی ہے کیا ہم یہ جواب تلاش کر سکتے ہیں؟

میاں غلام قادر

گوئٹے کا ''دیوانِ شرق وغرب''

شاعر مشرق علامہ اقبال نے اپنی فارسی تصنیف ''پیام مشرق'' میں تحریر فرمایا ہے:

''در جواب دیوان شاعر المانوی گوئٹے'' ''پیام مشرق'' کے دیباچے میں انہوں نے بار بار گوئٹے کی تصنیف کو ''مغربی دیوان'' لکھا ہے۔ علامہ اقبال کے برعکس شیخ عبدالقادر مرحوم نے بانگِ درا کے دیباچے میں اس تصنیف کو ''سلام مغرب'' سے تعبیر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''پیام مشرق'' میں ہمارے مصنف نے یورپ کے ایک نہایت بلند پایہ شاعر گوئٹے کے ''سلام مغرب'' کا جواب لکھا ہے......

جرمنی کے شہرہ آفاق شاعر، فلسفی، اعلیٰ منتظم، ڈرامہ نگار اور سائنسدان یوحان ولف گانگ فان گوئٹے (Johann Wolfgang Von Goethe) کو سب سے پہلے، برصغیر میں، حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے متعارف کرایا۔ وہ اپنے ہائیڈل برگ کے قیام کے دوران ان کے کلام اور شخصیت سے متاثر ہوئے۔

شاعر المانوی کو بچپن ہی سے قصے کہانیاں سننے اور لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ انہوں نے کم عمری میں ہی والدہ سے توراۃ کی اکثر کہانیاں سن لی تھیں۔ جب وہ سن شعور کو پہنچے تو انہوں نے نہ صرف لیلیٰ مجنوں، شکنتلا اور الف لیلیٰ وغیرہ کا مطالہ کیا بلکہ وہ قرآن پاک کے مطالعہ سے بھی فیض یاب ہوئے۔

۱۸۱۲ء میں جرمن دانشور Von Hammer (فان ہامر) نے خواجہ شمس الدین حافظ کے دیوان کا مکمل جرمن ترجمہ شائع کیا۔ یہ ترجمہ ۱۸۱۴ء میں گوئٹے کے زیر مطالعہ آیا اور ان کی گویا دنیا ہی بدل گئی۔ وہ جنون کی حد تک خواجہ حافظ کے گرویدہ ہو گئے اور ان کی پیروی میں اشعار کہنے لگے۔

۱۸۱۵ء میں گوئٹے کی ۵۰ نظمیں شائع ہوئیں۔ کتاب کا نام ''جرمن دیوان'' گوئٹے کا West-oestlicher Divan جو دیوان حافظ کی پیروی میں لکھا گیا ۱۸۱۹ء میں چھپا۔ اس میں ۱۸۱۵ء والے ''جرمن دیوان'' کی نظمیں بھی شامل ہیں۔ دیوان حافظ کے مطالعہ کے بعد گوئٹے نے ان نظموں میں تبدیلیاں کیں۔ راقم الحروف نے ''West - oestlicher'' دیوان کا اردو نثری ترجمہ بڑی دقت نظر سے کیا ہے۔ اس دیوان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تمام تر فضا مشرقی ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا

ہے کہ گوئٹے نہ صرف مشرقی روایات سے متاثر تھے بلکہ اسلام کے متعلق بھی کافی معلومات رکھتے تھے اور کسی حد تک دین اسلام کی حقانیت کے بھی قائل تھے۔ اس بات کا اظہار جا بجا ان کی نظموں میں ہوتا ہے اور بعض اوقات تو اظہار میں عقیدت کا رنگ جھلکتا ہے۔

یوں تو ''West-oestlicher Divan'' کا اردو ترجمہ ''مغربی مشرقی دیوان'' ہونا چاہے تھا مگر راقم الحروف نے اس کا ترجمہ ''دیوان شرق وغرب'' کیا ہے۔ جہاں تک ''مغربی دیوان'' والی بات کا تعلق ہے ممکن ہے حضرت علاّمہ اقبالؒ نے یہ نام ایک محقق مسٹر چارلس ریمی کے ''مختصر مگر نہایت مفید اور کار آمد رسالے'' سے لیا ہو۔ جس کا تذکرہ انہوں نے ''پیام مشرق'' کے دیباچے میں کیا ہے۔ بہرکیف حضرت علاّمہ اقبالؒ نے ''پیام مشرق'' کے شروع میں ہی ''وَلِلّٰہ المشرق والمغرب'' لکھ کر قصہ مختصر کر دیا۔

شاعر المانوی گوئٹے کی یہ دلی خواہش تھی کہ وہ اپنے دیوان کے توسط سے مشرق و مغرب کو قریب تر لائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دیوان کے بارہ ابواب کے نام فارسی میں رکھے۔ یعنی مغنّی نامہ، حافظ نامہ، عشق نامہ، تفکیر نامہ، رنج نامہ، حکمت نامہ، تیمور نامہ، زلیخا نامہ، ساقی نامہ، مثل نامہ، پارسی نامہ، خُلد نامہ۔

''دیوان شرق وغرب'' کا باب ''خُلد نامہ'' ۱۸۲۰ء میں لکھا گیا اور ۱۸۲۶ء کی کُلیات میں شامل کیا گیا۔ ''دیوان شرق وغرب'' کی نظم ''بہشت کا مژدہ پانے والے'' شہدائے بدر کی یاد میں لکھی ان کی حسین ترین نظم ہے۔ شہدائے بدر کے زخموں کا تذکرہ کر کے گوئٹے نے جس دل سوزی سے اپنے فگار سینے کا ذکر کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ ''دیوان شرق وغرب'' کی پہلی نظم ''ہجرت'' یارانِ نکتہ داں کے لئے غور وفکر کا وافر سامان لئے ہوئے ہے۔ شاعر المانوی شمال، جنوب اور مغرب کی بے ثمر زندگی سے بیزار ہو کر لوگوں کو مشرق کی سمت ''روحانی ہجرت'' کی دعوت دیتے ہیں اور یہی ان کی نظموں کا لُب لُباب ہے۔

قمر رُعینی

اردو رباعی میں فارسی رباعی کے تراجم

فارسی شعراء کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ کرنے والوں میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہوں نے فارسی رباعیات کا اردو رباعی میں ترجمہ کیا ہو اس کی بنیادی وجہ رباعی کے اوزان ہیں جن پر ہر شاعر کو قدرت نہیں ہوتی۔ رباعی سے رباعی میں ترجمہ کرنے والوں نے اپنی اپنی افتادِ طبع اور پسند کے مطابق شعراء کا انتخاب کیا کسی نے ابوسعید ابوالخیر کی رباعیوں کا انتخاب کیا تو کسی نے سرمد کا اور کسی نے حافظ شیرازی کا لیکن سب سے زیادہ فارسی رباعی کے جس شاعر کے منظوم تراجم ہوئے وہ خیام ہے۔

خیام پر گفتگو سے پہلے ان شعراء کا ذکر کرنا چاہوں گا جن کی رباعیوں کے تراجم اور رباعی میں کئے گئے اس طرح فارسی رباعی کے اردو رباعی میں تراجم کا تسلسل برقرار رہے گا۔ فارسی شعراء میں رباعی گو کی حیثیت سے خیام کے بعد برصغیر میں جس کو بہت شہرت ملی وہ سرمد ہے جس کی شخصیت اور عقائد کے بارے میں لوگوں کے خیالات میں اختلاف ہے کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ، لیکن اتنی بات سچ ہے کہ وہ رباعی کا شاعر تھا اور اس کی رباعیات خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کی رباعیوں کا اردو رباعی میں ترجمہ کرنے والوں میں صرف دو شعراء تک میری رسائی ہو سکی ہے جو حاضر ہے۔ سید نواب علی صولت (شاگرد، قوی امروہوی) نے سرمد کی رباعیوں کا اردو رباعی میں ترجمہ کیا جو بعد میں ''جواہر منظوم'' کے نام سے شائع ہوا۔ بطور نمونہ دو رباعیاں مع ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

سرمد	صولت
از جرم فزوں یافتہ ام فضل ترا	ہر جرم سے پایا ہے سو افضل ترا
ایں شد سبب معصیت بیش مرا	باعث یہ فزونی معاصی کا ہوا
ہر چند گنہ بیش، کرم افزوں تر	افزوں ہیں اگر گنہ، کرم افزوں تر
دیدم ہمہ جا و آزمودم ہمہ جا	دیکھا ہر طرح خوب سب کو جانچا

مشہور شدی بہ دل ربائی ہمہ جا   مشہور ہے تیری دل ربائی ہر جا
بے مثل شدی در آشنائی ہمہ جا   بے مثل ہے شان آشنائی ہر جا
من عاشق ایں طور تو ام می بینم   عاشق میں ہوا ہوں اس ادا پر تیری
خودرانہ نمائی و نمائی ہمہ جا   ہے پردے میں بھی جلوہ نمائی ہر جا

--------   --------

محمد مشتاق، شارق میرٹھی نے بھی سرمد کی ۱۱۴ رباعیوں کا ترجمہ کیا جو "الہامات سرمد" کے نام سے ۱۹۸۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔ نمونے کے طور پر دو رباعیات دیکھئے۔

سرمد   شارق میرٹھی

کردی تو علم بہ دل ربائی خودرا   مشہور جہاں ہے دل ربائی تیری
ہم در فن مہرو آشنائی خودرا   دنیا میں ہے عام آشنائی تیری
ایں دیدہ کہ بیناست تماشائی تست   کیوں محو تماشا نہ ہوں آنکھیں یارب
ہر لحظہ بہ صد رنگ نمائی خودرا   ہر رنگ میں ہے جلوہ نمائی تیری

--------   --------

آں کس کہ ترا تاج جہاں بانی داد   دی جس کی نوازش نے تجھے سلطانی
مارا ہمہ اسباب پریشانی داد   ہم کو غم دہر سے دی عریانی
پوشاند لباس ہر کرا عیبے دید   جو عیب سے پُر تھے انہیں بخشا ہے لباس
بے عیباں راہ لباس عریانی داد   بے عیبوں کو بخشی ہے فقط عریانی

--------   --------

بحوالہ تذکرہ شعرائے میرٹھ مرتبہ نور احمد میرٹھی (ص۹۲ص۵۹۰)

فارسی رباعی کے ایک اور مشہور صوفی شاعر اور بزرگ ہستی ابو سعید ابوالخیر ہیں ان کا پورا نام فضل الدین ابوالخیر خاورانی ہے۔ ۴۴۰ ھجر میں بہ عمر ۸۰ سال ان کا انتقال ہوا۔ ان کی ساری رباعیات ان کے مسلک کی ترجمان ہیں۔ ابو سعید کی رباعیوں کے تین ترجمے میری نظر سے گزرے ایک مقصود احمد مجددی کا دوسرا حکیم آزاد انصاری کا اور تیسرا معروف محقق شاعر اور ادیب مولانا حامد حسن قادری کا ہے۔ قادری نے ۹۸ رباعیات

اور مجددی نے ۲۱۶ رباعیات کا ترجمہ رباعی میں کیا۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

ابوسعید ابوالخیر کی ایک رباعی

باز آ باز آ ہر آں چہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ ما، درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اس رباعی کا ترجمہ دونوں نے کیا جو یہ ہے

مقصود احمد مجددی	حامد حسن قادری
جو کچھ بھی ہے جو حال ہے تیرا باز آ	باز آ جو کچھ ہے باز آ باز آ
کافر ہے کہ بت پرست و ترسا باز آ	کافر ہے کہ بت پرست و ترسا باز آ
درگاہ ہماری نہیں جائے حرماں	نومید نہ ہو ہماری درگہ سے تو
سو مرتبہ گو توڑی ہو توبہ باز آ	سو بار بھی توڑ دی ہے توبہ باز آ

دونوں ترجموں میں دوسرے مصرعے حرف بہ حرف متوارد ہیں اور اس سلسلے میں دونوں مترجمین کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا اب ابوسعید ابوالخیر کی مزید تین رباعیوں کے ترجمے دیکھئے جو حامد حسن قادری کی قادر الکلامی کا ثبوت ہیں۔

حامد حسن قادری	ابوسعید ابوالخیر
تیرِ ہوس و ہوا کا آماج ہوں میں	از بار گنہ شد تنِ مسکینم پست
یا رب مددے کہ بے نوا آج ہوں میں	یا رب چہ شود اگر مرا گیری دست
مجھ میں وہ عمل نہیں جو لائق ہو ترے	گر در عملم آں چہ ترا شاید نیست
تجھ میں وہ کرم ہے جس کا محتاج ہوں میں	اندر کرمت آں چہ مرا باید ہست

کر لیتا ہے سالک جورہِ فقر کو طے	آں را کہ فنا شیوہ و فقر آئین است
است پھر کشف و یقین و معرفت نہیں کوئی شے	بے کشف و یقیں نہ معرفت نے دین است
مٹ جائے خودی، خدا رہے صرف خدا	رفت او زمیان خد ہمیں ماند خدا
الفقر اذ تم ھو اللہ یہ ہے	الفقر ذتم ھوا اللہ این است

گر دور فنا دم از وصالت بہ ضرور — گو دور ہوں، رنجور ہوں مجبور ہوں میں
دادر دلم از یاد تو صد نوع حضور — ہر وقت تری یاد میں مسرور ہوں میں
خاصیت سایۂ تو دارم کہ مدام — خاصیت سایہ آگئی ہے مجھ میں
نزدیک توام اگر چہ می افتم دور — ہوں پاس ہی گو پڑا ہوا دور ہوں میں

خواجہ حافظ شیرزای کے کلام کے تراجم تو کئی لوگوں نے کیے ہیں لیکن رباعی چونکہ ایک ٹیکنیکل صنف ہے اس لئے اس طرح توجہ نہیں کی گئی البتہ لاہور سے شائع ہونے والا ایک کتابچہ میری نظر سے گزرا جس میں حافظ کی رباعیوں کا ترجمہ اردو رباعی کی صورت میں کیا گیا ہے۔ مترجم شاعر کا نام "راؤ جذب" لکھا ہے اور کتاب کا نام رباعیات حافظ شیرازی، صرف لفظ "جذب" واضح نہیں ہوتا کہ یہ کون سے جذب ہیں۔ ممکن ہے یہ حیدر آباد دکن والے راؤ جذب عالم پوری ہوں؟ بہر حال کتاب میں کوئی تفصیل یا سوانح نہیں ہے۔ اس کتاب میں حافظ کی (۷۶) رباعیوں کا اردو ترجمہ ہے اور اس میں سے بھی بتیس رباعیاں ایسی ہیں جنہیں رباعی کے اوزان میں ہونے کے باوجود رباعیاں نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ ان میں مطلع نہیں ہے۔ باقی چونتیس رباعیاں اصول رباعی کے مطابق ہیں۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیے

حافظ	جذب
گفتم کہ مگر با تفاق احباب	فصل گل با اتفاق احباب
در موسم گل کنم ترک بادہ ناب	تھا قصد میرا ترک کروں بادۂ ناب
بلبل ز چمن نعرہ زناں داد جواب	بلبل نے کیا شور چمن سے یہ کہا
کائی بے خبراں فصل گل و ترک شراب؟	نادان یہ کیا؟ بہار میں ترک شراب؟

حافظ	جذب
امروز کہ روز فرقت احباب است	ہے آج کا روز، روز ہجر احباب
نے وقت نشاط و عیش با اصحاب است	ممکن نہیں میں عیش کروں کیسے جناب
ہشیار از اں نیم کہ مے نیست مرا	میں مے کے نہ ہونے سے نہیں ہوں ہشیار
مے ہست ولے حریف مے نایاب است	مے ہے لیکن حریف مے ہے نایاب

غالب کی رباعیوں کے اردو رباعی میں ترجمے افتخار احمد عدنی میرٹھی اور صبا اکبرآبادی نے کئے۔ عدنی کی ایک رباعی مجھے "شخصیات میرٹھ" مرتبہ نور احمد میرٹھی سے دستیاب ہوئی اور صبا کی رباعی ان کی مطبوعہ کتاب "ہم کلام" سے۔ دونوں حاضر ہیں:

غالب	عدنی
گر ذوق سخن بہ دہر آئیں بودے	یاں ذوق سے عالم جو فروزاں ہوتا
دیوان مرا شہرت پرویں بودے	ہر شعر مرا نیر تاباں ہوتا
غالبؔ اگر ایں فن سخن دیں بودے	اشعار پہ ایمان جولاتی مخلوق
ایں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے	غالب مرا دیوان ہی قرآں ہوتا

اسی رباعی کا ترجمہ صبا اکبرآبادی نے یوں کیا۔

دنیا میں اگر ذوق سخن کا ہوتا	دیواں مرا پروین وثریا ہوتا
یہ شاعری دنیا کا جو مذہب ہوتی	ایمان اس کا کلام میرا ہوتا

صبا اکبرآبادی کی کچھ اور مترجمہ رباعیاں دیکھئے غالب نے مومن کے انتقال پر درج ذیل رباعی کہی جس میں مومن کافر اور کعبہ سیہ پوش کی رعایت لفظی خصوصیت سے قابل توجہ ہے۔

غالب	صبا
شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر	لازم ہے کہ زندگی میں غم کوش رہوں
خون نابہ بہ رخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر	درد الم جاں سے ہم آغوش رہوں
کافر باشم اگر بہ مرگ مومن	مومن مرجائے پھر میں کافر تو نہیں
چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر	کعبہ کے طرح کیوں نہ سیہ پوش رہوں

ایک عام رباعی کا ترجمہ دیکھئے:

غالب	صبا
آنے کو تو شخص مردے را چشمے	تو بزم میں ہنس ہنس کے اٹھائے آنکھیں
سبحان اللہ چہ مایہ بینا چشمے	دانستہ مریضوں سے لڑائے آنکھیں

البتہ عجب نیست کہ باشد بیمار	پھر اس کی شفایابی کی امید نہیں
زاں روکہ بہ دل بری سراپا چشمے	تو جس سے بہ صد ناز ملائے آنکھیں

علامہ اقبال کے یہاں لالۂ طور کے عنوان سے جو فارسی کلام ہے اسے علامہ نے رباعیات کا نام دیا ہے جبکہ وہ دوبیتیاں ہیں فنی طور پر رباعیاں نہیں لیکن چونکہ میرا موضوع اردو رباعی میں فارسی کے تراجم ہے اس لئے اردو رباعی میں لالہ طور (دوبیتیوں) کے تراجم کا ذکر بھی کر رہا ہوں۔

ایک اچھے مگر کم مشہور رباعی گو جناب سعید احمد اعجاز (لاہور) نے علامہ اقبال کی فارسی دوبیتیوں کا اردو رباعی میں ترجمہ کیا رباعیاں معہ اصل متن ملاحظہ فرمائیے۔

لالۂ طور (علامہ اقبال)	(ترجمہ) سعید احمد اعجاز
شہید ناز او بزم وجود است	ہے اس کی شہید ناز یہ بزم وجود
نیاز اندر نہاد ہست و بود است	معمور نیاز ہے دل ہست و بود
نمی بینی کہ از مہر فلک تاب	وہ دیکھ کہ خورشید فلک پیما سے
بہ سیمائے سحر داغ سجود است	پیشانی آسماں پہ ہے داغ سجود
چہ لذت یارب اندر ہست و بود است	یا رب ہے عجیب لذت ہست و بود
دل ہر ذرہ در جوش نمود است	ہر ذرے کے دل میں ہے تمنائے نمود
شگافد شاخ راچوں غنچۂ گل	جب شاخ کو چیرتی ہے ننھی سی کلی
تبسم ریز از ذوق وجود است	دیتا ہے تبسم اسے احساس وجود

اردو رباعی میں رباعیات خیام کے تراجم

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ سب سے زیادہ جس فارسی شاعر کی رباعیوں کے ترجمہ کئے گئے وہ خیام ہے یعنی خیام کو رباعی گو کی حیثیت سے اتنی شہرت دی گئی کہ اس کے دیگر علمی اور قابل ذکر کارنامے اور کاوشیں پس پردہ چلی گئیں ایک حادثہ یہ بھی ہوا کہ خیام کو فٹز جیرالڈ نے متعارف کروایا اور خیام کو خدا و مذہب کا باغی اور شرابی ثابت کیا جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

اب یہ معلوم نہیں کہ یہ حرکت فٹز جیرالڈ نے دانستہ کی یا زبان غیر کی لطافتوں اور نفسیات سے ناواقفیت کی بناء پر مگر ہوا یہ کہ خیام کے بیشتر شارحین و مترجمین نے اس نظریئے کو پروان چڑھایا۔ اس مقصد کو

حاصل کرنے اوراپنے موقف کومضبوط بنانے کے لئے دوسرے شعراء کی رباعیاں خیام سے منسوب کی گئیں اور خیام کی تھوڑی سی رباعیاں بڑھتے بڑھتے سینکڑوں سے متجاوز ہوگئیں۔اس وقت چونکہ میرا موضوع سوانح خیام نہیں بلکہ رباعی سے رباعی میں ترجمہ ہے اس لئے اس موضوع پر میں اس وقت کوئی گفتگو مناسب نہیں سمجھتا۔ رباعیات خیام کے منظوم تراجم قطعات میں بھی کئے گئے اور رباعی کی صورت میں بھی۔رباعیات خیام کے منظوم تراجم مختلف زبانوں میں بھی ہوئے برصغیر میں، ہندی، سنسکرت، اڑیا، تلگو، مراٹھی، پشتو، سرائیکی اور پنجابی میں ہوئے۔

اردو رباعی میں اب تک کی تحقیق کے مطابق سب سے پہلا ترجمہ راجہ مکھن لال نے کیا لیکن یہ ترجمہ بہت تاخیر سے شائع ہوا یعنی ساٹھ کی دہائی میں چھپا۔جبکہ قوی امروہوی کا ترجمہ جو ۶۴۷ رباعیوں پر مشتمل ہے وہ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔قوی کے بعد آغا شاعر کا ترجمہ منظر عام پر آیا اور اب تک کئی ترجمے ایسے شائع ہو چکے ہیں جو رباعی سے رباعی پر مشتمل ہیں اور بعض شعراء کے تراجم اگرچہ کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے (یا ہوئے تو مجھے معلوم نہیں) ان میں سے کسی کے یہاں کچھ زیادہ تعداد میں رباعیاں ہیں کسی کے یہاں کم مثلاً قوی امروہوی نے ۶۴۷ رباعیوں کا ترجمہ رباعی میں کیا اور آغا شاعر کا پہلے ۲۰۰ کا بعد میں ۶۴۰ رباعیوں کا ترجمہ شائع ہوا اور مشہور بھی خوب ہوا کسی نے ان کے ترجمے پر عروضی نقطہ نگاہ سے غور نہیں کیا اس میں شک نہیں کہ آغا شاعر بھی قوی کی طرح قادر الکلام شاعر ہیں اور رباعی کے اوزان ولوازمات کو یقیناً سمجھتے پھر بھی کئی جگہ ان کا تقاضائے بشریت بہت واضح ہے۔مثلاً انہوں نے ایک جگہ سورج پرور کی ترکیب استعمال کی جو یقینی طور پر غلط ہے وہ مصرعہ یہ ہے: ہر ذرہ ہے اس کا لاکھ سورج پرور۔بعض مصرعوں کے بے وزن ہونے میں کتابت کی غلطی کا امکان ہے اور بعض جگہ شاعر کی بے توجہی کی عکاسی ہوتی ہے جیسے یہ مصرع دیکھئے۔

ع ساقی نہیں اس زندگی میں رہبر کوئی۔ (رباعی ۳۰۸)

بے وزن ہے اگر لفظ ''اِس'' نکال دیں تو ٹھیک۔رباعی ۵۴۶ میں رحلت کے ساتھ ''بہت'' کا قافیہ باندھا ہے بہر حال جیسے میں نے عرض کیا یہ ترجمہ اتنا مشہور ہوا کہ قوی کا ترجمہ دب گیا۔حالانکہ ان کی کتاب بھی تاج الکلام کے نام سے چھپ گئی تھی۔قوی اور آغا شاعر کے علاوہ رباعی سے رباعی میں ترجمہ کرنے والوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔شوکت بلگرامی، طالب جے پوری، صبا اکبر آبادی (دست زرفشاں) راجہ مکھن لال (نذر خیام) مولانا صفی لکھنوی، آزاد انصاری، نادان دہلوی، کاشی پریاگی (صرف دس رباعیات)

عدم (کتاب دو جام) جس میں رباعیات بھی ہیں لیکن قطعات زیادہ ہیں) یہی صورت حال پروفیسر واقف دہلوی کے ترجمے میں اور یہی صورت مالک کانپوری کے یہاں ہے یعنی رباعیات کم اور قطعات زیادہ جابر علی سید نے بھی کچھ رباعیوں کے ترجمے رباعی میں کیے لیکن مجھے صحیح تعداد معلوم نہیں بطور نمونہ ایک رباعی مل سکی وہ میں نے محفوظ کر لی ہے اور ایک سال قبل ناچیز راقم الحروف نے بادہ خیام کے نام سے ایک سو رباعیات خیام کا اردو رباعی میں ترجمہ شائع کیا جس میں ایران کے کلچرل قونصلر جناب ڈاکٹر رضا مصطفوی کا مقالہ بہ عنوان، ترجمہ سرائیکی ناشناختہ اور پیش گفتار بھی شامل ہے اور جناب ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی کا مجھ ناچیز کے بارے میں فارسی میں مضمون اور ایک نظم بھی شامل اشاعت ہے۔ مندرجہ بالا ترجمہ کے علاوہ ایک اردو ترجمہ بھی بیان کیا جاتا ہے جسے میں نے نہیں دیکھا اور نہ کہیں سے نمونہ دستیاب ہوا۔ البتہ راجہ مکھن لال کی کتاب نذر خیام میں اس کا ذکر ہے کہ گورسرن بلی آزاد توکلی نے بھی ۲۰۰ رباعیات خیام کا ترجمہ اردو رباعی میں کیا ہے۔ واللہ علم۔

قوی امروہوی کے یہاں بھی کئی مقامات آہ و فغاں موجود ہیں اور ان کی علمیت کے پیش نظر میں یہی گمان کر سکتا ہوں کہ یہ سب کچھ پروف ریڈنگ میں بے توجہی کے سبب ہوا اور خدا کرے کہ ایسا ہی ہو' فی الحال آپ خیام کی رباعی کے اردو رباعی میں ترجمے دیکھیے۔

خیام

(۱) آمد سحرے انداز میخانہ ما — کاے رند خرا باتی و دیوانہ ما
برخیز کہ پرکنیم پیا نہ زمے — زاں پیش کہ پرکنند پیانہ ما

راجہ مکھن لال

(۲) دی باد سحر نوید دیوانے کو — یعنی دِل مے گسار مستانے کو
اٹھ بھرلیں بہ عشق دوست ساغر اپنا — اس سے آگے بھریں جو پیانے کو

قوی امروہوی

(۳) اک صبح ندا آئی یہ مے خانے سے — اے رند خرابات مرے دیوانے
قبل اس کے مے ناب سے بھر لے ساغر — پیانہ تن سے بادہ جاں چھلکے

آغا شاعر

(۴) آئی یہ ندا صبح کو میخانے سے — اے رند شراب خوار، دیوانے سے
اٹھ جلد بھریں شراب سے ساغر ہم — کمبخت چھلک نہ جائے پیانے سے

شوکت بلگرامی

(۵) سرمست ولا کو ساقی مہرانگیز دیتا ہے یہ ہر سحر صدا اور دآمیز
لے جام صبوحی، آنکھ کھول اے مخمور ہو جائے نہ زندگی کا ساغر لبریز

صفی لکھنوی

(۶) پیمانے سے آئی یہ دم صبح ندا اے رند خرابات ہمارے شیدا
اٹھ جام کو تیرے کریں مے سے لبریز قبل اس کے کہ پیمانہ ہو لبریز تیرا

عدم

(۷) کل صبح خرابات سے آئی یہ ندا اٹھ جاگ صراحی مئے خنداں کی اٹھا
کب ٹوٹ کے ہو جاتا ہے ریزہ ریزہ پیمانہ ہستی کا نہیں کوئی پتا

صبا اکبرآبادی

(۸) اک صبح کو میخانے سے آئی یہ ندا اے رند خرابات مرے سن تو ذرا
اٹھ جلد کہ پیمانے کو مے سے بھر لیں اس سے پہلے کہ پر ہو پیالہ اپنا

جابر علی سید

(۹) میخانے سے آئی یہ سحر گاہ صدا کیوں خواب میں ہے محو مرا دیوانہ
اٹھ جام شراب اپنا لبریز کریں قبل اس کہ لبریز ہو پیالہ اپنا

قمر رعینی

(۱۰) اک صبح ندا آئی مے خانے سے ساقی نے کہا اپنے دیوانے سے
پیمانہ زندگی کے بھر جانے تک پیمان وفا نہ توڑ پیمانے سے

افشاں قاسمی

اردو میں تنقیدی ارتقا کا جائزہ

اردو کے مشہور تنقید نگار کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ ''اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر'' کلیم الدین احمد مغربی نظریات سے بہت متاثر ہیں اور ان کی تنقیدوں میں افراط اور تفریط زیادہ جھلکتی ہے وہ جب بھی کسی چیز کے بارے میں رائے دیتے ہیں تو اس میں انتہا پسندی کی جھلک نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔۔۔۔۔اردو شاعری پر ایک نظر کے تحت انہوں نے غزل کے بارے میں بھی اسی قسم کی رائے دی تھی۔ کہ غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے اس انتہا پسندی کے باوجود کلیم الدین احمد کی رائے سے مکمل طور پر انکار نہیں کیا جاسکتا ایسا لگتا ہے کہ وہ اردو تنقید کو مغربی تنقید کے آئینہ میں دیکھتے ہیں اور جب اس میں کمی یا خامی محسوس کرتے ہیں۔ تو اپنی رائے دیتے ہیں کہ اردو میں تنقید کا وجود ہے ہی نہیں یہ بات نصف صداقت کے مترادف ہے اور نصف صداقت ہمیشہ خطرناک ہوتی ہے اردو کی جدید تنقید نگاری جو مجنوں گورکھپوری فراق گورکھپوری، احتشام حسین اور مجتبیٰ حسین سے شروع ہوتی ہے اتنی کم مایہ نہیں کہ کلیم الدین صاحب کی رائے پر بغیر سوچے سمجھے اعتبار کرلیا جائے۔

ہمارے قدیم تنقید نگار بھی کم پایہ کے نہیں تھے یہ حقیقت ہے کہ وہ مغربی تنقیدی اصولوں سے واقف نہیں تھے مگر جس پائے کی کتابیں انہوں نے لکھی ہیں وہ کسی بھی بڑے سے بڑے انگریزی ادیب کے مقابلہ میں رکھی جاسکتی ہیں۔ شبلی کی ''شعر العجم'' فارسی شعراء پر بلند پایہ تنقیدی کتاب ہے جس سے مغربی مستشرقین نے جا بجا استفادہ کیا ہے موازنہ انیس و دبیر عملی تنقید کا بڑا اہم نمونہ ہے۔ حالی کا مقدمہ شعر و شاعری اپنی تمام خامیوں کے باوجود تنقیدی اسلوب اور تنقیدی جائزے کی اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے۔ انتہا یہ کہ آب حیات کے چھوٹے چھوٹے جملے اپنے اندر ایسی بھرپور تنقیدی رائے سموئے ہوئے ہیں۔ جن کو پھیلا کر لکھا جائے تو ایک طویل مضمون لکھا جاسکتا ہے۔

اردو میں تنقید کے ابتدائی نقوش تذکروں میں نظر آتے ہیں یہ تذکرے بالعموم فارسی میں لکھے گئے ہیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے چند اہم تذکروں کے نام یہ ہیں۔

(۱) نکات الشعراء میر تقی میر (۲) گلشن گفتار حمید اورنگ آبادی

(۳) تحفۃ الشعراء مرزا افضل بیگ قاقشال (۴) ریختہ گویاں فتح علی حسینی (گردیزی)

(۵) مخزن نکات قیام الدین قیام

نوٹ: تذکروں کی مکمل تفصیل: اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری فرمان فتحپوری کی کتاب دیکھی جاسکتی ہے۔

یہ تمام تذکرے فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ اردو کے پہلے تذکروں میں ''گلشن ہند'' مرزا علی لطف کا اور ''گلدستۂ حیدری'' حیدر بخش حیدری کا لکھا ہوا ہے۔ ان تذکروں کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں اردو شعراء کے نام اور ان کے آباؤ اجداد ان کے دواوین کے نام اور تعداد کو قلم بند کر دیا گیا ہے۔ ان تذکروں میں شعراء کی زندگی کے چند واقعات اور ہلکا پھلکا تبصرہ انکی شاعری پر بھی ملتا ہے ان تذکروں میں کہیں کہیں تعریف یا تنقید کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ البتہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا تذکرہ ''گلشن بے خار'' وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں نسبتاً بعض شعراء کے بارے میں بے لاگ رائے کا اظہار نظر آتا ہے میر کے سلسلے میں ان کی یہ رائے ہے کہ ''ان کا کلام جہاں بلند ہے بہت بلند ہے اور جہاں پست ہے بہت پست ہے۔'' قابل غور ہے۔ مگر ان تذکروں میں شعراء کی زندگی ان کی ذات اور شاعری کے بارے میں کوئی رائے ایسی نہیں ملتی جس سے انکی زندگی یا فن کا کوئی پہلو واضح ہو سکے تاہم تذکروں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ذریعہ اردو شعراء کی عہد بہ عہد کی تاریخ محفوظ ہوگئی۔ ابتدائی عہد کے تذکرہ نگار اس سے زیادہ تنقیدی شعور نہیں رکھتے تھے اور نہ ان سے توقع رکھنی چاہیے۔ البتہ انیسویں صدی کے ابتداء میں جب مغربی نظریات ہندوستان میں آئے اور فورٹ ولیم کالج کی کوششوں نے علمی اور ادبی شعور کو ابھارا تو اس کے اثرات تذکرہ نگاروں نے بھی نمایاں طور پر قبول کئے اور اس زمانے کے ناقدین یا تذکرہ نگاروں کے شعور میں نمایاں طور پر تبدیلی پیدا ہوئی۔ ''گلزار ابراہیم''، ''طبقات الشعرائے ہند''، گلستان سخن، گلشن بے خار، اور آب حیات ان تمام تذکروں میں تنقیدی شعور کا ارتقاء نظر آتا ہے تذکروں کی اہمیت پر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں۔

''ادبی تنقید کی طرح اردو میں ادبی سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش بھی انہیں تذکروں میں ملتے ہیں چنانچہ قدیم شعراء کی زندگی اور سیرت وشخصیت کے متعلق جتنی کتابیں یا مکالمات اب تک مرتب ہوئے ہیں یا ولی کے عہد سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک شعراء کے متعلق جو واقعات وحالات سامنے آئے ہیں ان سب کا سر چشمہ یہی تذکرے ہیں دکنی شعراء سے لیکر شمالی ہند کے ممتاز اردو شعراء حاتم، سودا، میر یقین، قائم، مصحفی، انشا، آتش، ناسخ، جرأت، میر حسن تاباں، غالب، مومن، ذوق، نسیم، انیس، دبیر اور ظفر وغیرہ کے کلام اور زندگی کی

جتنی تصویریں آج ہمارے سامنے ہیں وہ انھیں تذکروں کی مدد سے تیار کی گئی ہیں اور یقین ہے کہ آئندہ بھی جو کچھ لکھا جائے گا انہی تذکروں کے سہارے لکھا جائے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ بعض تذکروں میں باہمی رنجش یا دوستی کے بنا پر غیر متوازن تعریف یا برائی ملتی ہے لیکن بعض تذکرے اس قسم کی جانبداری سے پاک بھی ہیں۔ اور اگر ہلکی سی جانب داری ہو بھی تو انکی تاریخی اہمیت سے انکار ممکن نہیں تاہم بعض تذکرے اس قسم کے عیوب سے تقریباً پاک ہیں نکات الشعراء (میر تقی میر) تذکرۃ الشعراء (میر حسن) گلشن بے خار (محمد مصطفےٰ خان شیفتہ) گلزار ابراہیم (علی ابراہیم خلیل) خوش معرکہ زیبا (سعادت حسن خان) اور آب حیات (محمد حسین آزاد) ایسے تذکرے ہیں جن میں توازن ہے اور حتیٰ الامکان اس بات کی کوشش ملتی ہے کہ جو کچھ لکھا جارہا ہے اس میں غیر جانب داری سے کام لیا جائے اور جہاں تک عدم توازن کا تعلق ہے تو آج کی ترقی یافتہ تنقید بھی اس سے قطعی طور پر مبرا نہیں ہے اردو کا سب سے اہم تذکرہ آب حیات ہے۔ آب حیات نہ صرف تذکرہ ہے بلکہ وہ ایک سوانح عمری' تنقید۔ تہذیبی جائزہ اور تخلیقی ادب کا شہکار بھی ہے۔ تاہم آب حیات نے تنقید اور فنی صلاحیتوں کے لئے راہیں کھول دیں' یہ اس کا اہم کارنامہ ہے۔

آزاد ہی کے زمانے میں برصغیر بہت بڑے انقلابات سے دوچار ہورہا تھا۔ مغلیہ عہد ختم ہو چکا تھا اور برطانوی عہد قائم ہو رہا تھا۔ سرسید کی تحریک نے ذہنوں کو بدلنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ جس کے سبب نیا تعلیم یافتہ طبقہ ابھرنے لگا تھا اور مغربی علوم وفنون درسگاہوں میں جگہ لے چکے تھے۔ لہٰذا اردو ادب بھی ان معاشرتی تغیرات سے بچ نہ سکا۔ چنانچہ حالی اور آزاد کے ہاتھوں نظم جدید کا آغاز ہوا۔ نثر نگاری میں بھی مغربی اصولوں سے متاثر ہو کر تبدیلیاں پیدا ہونی شروع ہوئیں اور مبالغہ آرائی' لفظی صناعی کی بجائے حقیقت نگاری اور سادگی ء بیان اور سنجیدہ مسائل اردو نثر میں جگہ لینے لگے۔

حالی نے جہاں جدید شاعری کو نئی آواز اور نئے خیالات دیئے وہاں تنقید نگاری میں بھی نئی راہیں اختیار کیں' مقدمہ شعروشاعری اردو تنقید نگاری کی ایک عہد آفریں کتاب ہے۔ اس میں پہلی بار حالی نے ادب اور معاشرے کے روابط کو دریافت کیا اور اس پر بحث کی اور ادب کو زندگی کی ترجمانی کا نہایت اہم اور کارآمد ذریعہ قرار دیا۔ گویا ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کا نظریہ حالی کے مقدمہ شعروشاعری کی بدولت اردو میں آیا۔ حالی کی زبان بھی تنقید کیلئے موزوں ترین زبان ہے کیونکہ ان کے ہاں سلاست۔ آہستہ روی۔ احتیاط پسندی۔ اعتدال اور بڑی حد تک غیر جانبداری ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ حالی مغربی ادب سے واقف نہیں تھے اور

انہوں نے ملٹن اور میکالے کے حوالے سن سنا کر دے دیئے جو ان کی تنقیدی اہمیت کو کم کر دیتے ہیں۔ نیچرل شاعری پر بھی ان کی بحث کمزور ہے۔ اور بعض جگہ صحت سے دور بھی اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ ادب اور تنقید یا تبلیغ میں فرق نہیں سمجھتے۔ لیکن یہ بھی کیا کم ہے کہ مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ پہلی بار شعر کی ماہیت۔ معاشرتی اثرات۔ شاعری کے فن اس کی اثر انگیزی اور معاشرتی ضرورت سے بحث کی گئی ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مقدمہ (شعر و شاعری) کی گونج آج کی جدید ترین تنقیدوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ حالی نے تنقیدی شعور کو بہر حال متاثر کیا ہے۔ خواہ ان کے نظریات سے کتنا بھی اختلاف کیا جائے۔ یہاں اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اردو میں تنقید ایک باقاعدہ صنف کی صورت میں حالی کی وساطت ہی سے آئی ہے۔ اس لحاظ سے حالی اردو ادب کے سب سے پہلے تنقید نگار ہیں۔

حالی کے بعد چند رومانی تنقید نگار سامنے آئے۔ جنہوں نے مغربی ادب سے براہ راست استفادہ کیا تھا۔ ان میں مہدی افادی اور عبدالرحمٰن بجنوری کے نام اہم ہیں۔ افادات مہدی ان کے مضامین اردو کے عناصر خمسہ' اور شبلی و حالی کی معاصرانہ چشمک اور بجنوری کی کتاب ''محاسن کلام غالب'' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ بجنوری کی تحریر بڑی دلکش ہے اور اس لئے لوگوں کو یہ کتاب بڑی پسند آئی۔ اس میں تنقیدی اعتبار سے غالب فہمی کی بجائے' غالب پسندی کا غلبہ ہے اور اس طرح تنقید کی بجائے یہ غالب پسندی کی تحریک بن گئی۔ ان کا یہ جملہ کہ ''وید مقدس'' اور ''دیوان غالب'' ہندوستان کی الہامی کتابیں ہیں۔ رومانی تنقید کی راہیں کھول دیتا ہے۔ نیاز فتحپوری بھی ایک حد تک رومانی تنقید نگار ہیں۔ مگر ان کے ہاں لفظوں پر گرفت زیادہ ہے اور تنقید میں لفظی خامیوں کی طرف زیادہ اشارے ملتے ہیں۔

ان کے بعد وہ تنقید نگار آتے ہیں جنہوں نے اردو ادب کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے اور ساتھ ہی اردو ادب پر بھی ان کی نظر گہری ہے۔ ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک شروع ہوگئی۔ جو سر سید تحریک کے بعد اردو ادب کیلئے مؤثر ترین تحریک ثابت ہوئی۔ اس تحریک کے پیشرو حالی تھے لیکن ان کی نظر اصلاح پر زیادہ تھی جبکہ دوسرے ترقی پسند ناقدین انقلاب کے علمبردار تھے۔ ان میں مجنوں گورکھپوری۔ مجتبیٰ حسین۔ آل احمد سرور۔ احتشام حسین۔ ممتاز حسین۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ اور ایک حد تک فراق گورکھپوری بھی ایسے تنقید نگار ہیں جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ یا متاثر ہیں۔

یہ نقاد مارکسی تنقیدی اصولوں اور مغربی تنقیدی اصولوں کے ساتھ ساتھ اپنے ادب کی روایات پر بھی

نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے شعر اور ادب پر قلم اٹھاتے وقت ان کے تاریخی عہد' انفرادی رجحانات اور معاشی حالات سب کا جائزہ لیا ہے۔ ادبی اور سماجی اقدار کے حوالوں سے بات کرتے ہوئے ان تنقید نگاروں نے اردو تنقید کو جذباتی ' داخلی اور انفرادی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے رویے سے بچایا ہے۔ ان کے ہاں تاثراتی تنقید نگاری نظر آتی ہے۔ صرف فراق صاحب ایسے نقاد ہیں جن کے یہاں خالص تاثراتی تنقید ملتی ہے۔ جو ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ مل کر تخلیقی کارنامہ بن گئی۔

تنقید نگاری کے چند اہم رجحانات میں' رومانی رجحان ہے۔ دوسرا فنی رجحان' تیسرا عملی رجحان' اسی کے تحت تنقید کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ۱۔ رومانی تنقید ۲۔ فنی تنقید ۳۔ عملی تنقید

رومانی تنقید کے تحت جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ مہدی افادی اور عبدالرحمٰن بجنوری کے نام آتے ہیں اور فنی تنقید کا تعلق زبان و بیان لفظوں کی صحت قواعد اور معنوی محاسن سے ہے۔ اس کے تحت نیاز فتحپوری کا نام سرفہرست ہے۔ تنقید کی تیسری اور اہم قسم عملی تنقید ہے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں۔

'' تنقید کی تیسری منزل عملی تنقید ہے۔ یہ ناقد کے ادبی ذوق اور اس کے معاشرتی شعور کا امتحان ہوتی ہے۔ یہاں ناقد براہِ راست ادب سے بحث کرتا ہے۔ یہاں وہ نظریوں میں بات کرنے کی بجائے ادب سے ادب ہی کی زبان میں بات کرتا ہے۔ اور اس کے تخلیقی سر چشموں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے یہاں دو طریقے اپنانے پڑتے ہیں۔ کسی خاص تصنیف کو پرکھتے وقت اسے اس کے مصنف کی نظر سے بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ اور ایک ناقد کی نظر سے بھی۔ عملی تنقید میں ناقد کے لئے ادیب کی جذباتی اور فکری زندگی سے ممکنہ قربت لازمی ہے۔ اس کے بغیر وہ ادب کے حسن و قبح سے بمشکل ہی واقف ہوتا ہے۔ ادب شناسی کی اس سعی میں وہ بعض اوقات ادب کے ان پہلوؤں کو بھی اجاگر کر دیتا ہے۔ جو خود ادیب کی نظر سے چھپے رہتے ہیں۔ اس نوع کی تنقید میں تنقید نگار اپنے تمام علمی اکتسابات اور ادبی تربیت سے کام لیکر ادب کو پرکھتا ہے۔ اس کی ہر سانس پر کان لگائے رہتا ہے۔ اس کی ہر کروٹ پر نظر رکھتا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ ادب کے جمال پنہاں کو ہمارے سامنے آشکار کر سکتا ہے۔''

عملی تنقید اگرچہ تنقید نگاری کی ایک شاخ ہے لیکن یہ سب سے مشکل صنف ہے۔ اس میں نظریاتی تنقید سے کام نہیں چلتا۔ بلکہ شاعر یا ادیب کی تخلیقی صلاحیت۔ اس کی نفسیاتی کیفیت اور اس کے اظہار کی خوبی یا نقص پر دلائل اور احساسات کے ساتھ بحث کی جاتی ہے۔ تنقید کی ایک اور قسم بھی ہے جس کو ہم تخلیقی تنقید کہہ

سکتے ہیں۔ یہ غالباً اتنی ہی بڑی ہوتی ہے جتنا بڑا ادیب یا شاعر۔ تنقید نگار یہاں ادب کو ادیب اور شاعری کو شاعر بن کر دیکھتا ہے۔

یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اس میں ادیب یا شاعر کی بنیادی تحریک کو دریافت کرنے کا کام ہوتا ہے۔ اور اس دریافت کے سہارے ادیب کی تخلیقات کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ جو ایسی فضا پیدا کرتا ہے کہ پڑھنے والے ان تخلیقات کی فضا میں سانس لینے لگتے ہیں۔ تنقید کا سب سے اہم کام پڑھنے والوں کو تنقید کے اصولوں اور ادب کے فوائد یا نقصانات سے آگاہ کرنا نہیں بلکہ ان میں وہ کیفیت پیدا کرنا ہے کہ پڑھنے والا خود تخلیق کی طرف مائل ہو جائے۔ تنقید کی ان موٹی موٹی قسموں کے علاوہ چند ضمنی شاخیں بھی ہیں' مثلاً جمالیاتی تنقید' نفسیاتی تنقید' تاثراتی تنقید۔

محمد حسن عسکری کا نام اس نوع کے تنقید نگاروں میں سب سے اہم ہے۔ انہوں نے اردو کی روایات کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اسے جمالیاتی اقدار اور نفسیاتی کشمکش کے آئینہ میں دیکھا اور پیش کیا ہے۔ محمد حسن عسکری نے کلیم الدین احمد کی طرح مغربی ادب سے بھی حوالے دیئے ہیں۔ ان کے ہاں ایک نیا رجحان بھی ملتا ہے جو مذہبی اقدار کے ذریعہ سے ادب کو پرکھنا ہے۔ ان کے نزدیک ادب مذہبی اقدار کے ذریعہ یا احساس سے جنم لیتا ہے اور انہی اقدار کو احساس میں زندہ کرتا ہے۔

ہماری تنقید نگاری میں چند اور نام بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ' وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ان حضرات کی تنقیدیں جدید و قدیم ادب کی روایات سے باخبری کے ساتھ ساتھ ادبی تحریکات کو پیش کرتی ہیں۔ اور ادب کا تجزیہ کرتی ہیں۔ ان تنقیدوں میں **Origionality** ہے اور ادب کا تنقیدی جائزہ اسی پس منظر میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس میں ادب کی تخلیق ہوئی ہے۔ یہ تنقید نگار مغربی تنقیدی اصولوں کے آئینے میں کسی تخلیق کو نہیں پرکھتے۔ ادب جو زندگی کا عکاس ہے اس کی تنقید کو مغربی تہذیبی رویوں کے ساتھ جوڑنا زندگی کو نہ سمجھنے کے مترادف ہے ان کے بعد کے تنقید نگاروں کی ایک لمبی فہرست ہے جو ایک علیحدہ مضمون کی متقاضی ہے۔

نوید ظفر

سوات

یوں تو مری نگاہ نے دیکھے ہیں سو جہاں مگر حسنِ سوات کی قسم حسنِ سوات اور ہے

قابل گلاؤٹھوی

کاغان کی خوبصورت وادی سے ملحق سوات کی حسین وادی ہے کوہ ہندوکش کے دامن میں' یہ خوبصورت وادیاں دنیا کے حسین ترین مقامات میں شامل کی جاسکتی ہیں' یہاں خوبصورت پہاڑوں کے دامن میں سرسبز وادیاں' گنگناتے چشمے' حسین لوگ اور مصروف زندگی کے تمام رنگ دیکھے جاسکتے ہیں' سوات کی وادی کا روایتی صدر مقام سیدوشریف اب مالاکنڈ ڈویژن کی انتظامی حد بندی میں شامل ہو چکا ہے' چنانچہ سوات ڈسٹرکٹ کا صدر مقام اب مینگورہ کو قرار دیا گیا ہے۔ مینگورہ' سیدوشریف سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر جڑواں شہر گردانا جاتا ہے' ان دونوں شہروں کا پشاور سے فاصلہ تقریباً ۱۵۰ کلومیٹر ہے اور پختہ سڑک اس وادی کے تمام شہروں اور قصبوں کو منسلک رکھتی ہے۔

مینگورہ اور سیدوشریف سطح سمندر سے ۳۱۵۰ فٹ بلند ہیں اور گرمیوں میں اپنی لطیف آب و ہوا کی وجہ سے بڑی کشش رکھتے ہیں' سیدوشریف میں زمرد کی کانیں' عجائب گھر اور ریشم کی گھریلو صنعت سیاحوں کی دلچسپی کا خصوصی مرکز ہیں۔

سیدوشریف سے دس کلومیٹر دور اودے گرام کا تاریخی اور قدیم شہر ہے' جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شہر سات سلطنتوں کا صدر مقام رہا ہے' قدیم تہذیب کے کھنڈر یہاں اب بھی پائے جاتے ہیں' اس شہر کی تاریخ کشان حکمران واسودیو کے دور سے منسلک کی جاتی ہے' ایک روایت کے مطابق محمود غزنوی کے جرنیل خوشحال خان کے عہد میں یہ شہر اسلام سے روشناس ہوا اور مسلم حکومت میں شریک ہوا۔

قریب ہی ''مرغزار'' کا خوبصورت شہر ہے۔ ۴۲۰۰ فٹ کی بلندی پر مرغزار کا حسین شہر' جنگل میں منگل کا رنگ پیش کرتا ہے' درختوں اور سبزے کی کثرت کے سبب گنے کی فصل کے دوران پہاڑوں سے ریچھ کھیتوں تک اتر آتے ہیں۔ قدیم حکمرانوں کا سفید محل سیاحوں کی توجہ کا خصوصی مرکز رہتا ہے سفید محل اب ہوٹل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

مرغزار کے ایک جانب آئیم کی چوٹی پر ۹۰۰۰ فٹ کی بلندی پر رام تخت کے مقام پر ایک مندر کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ مقامی روایات کے مطابق یہاں دوسرا بدھ پیدا ہوا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق رام چندر جی یہاں سے گذرے تھے۔ وادی سوات میں میاندم ۶۰۰۰ فٹ کی بلندی پر سب سے خوشگوار شہر ہے۔ میاندم کی بلندی سے سوات کی وادی پوری طرح پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ دریائے سوات کے ایک طرف مدین شہر آباد ہے' جہاں ٹراؤٹ مچھلی کا شکار مہیا ہوتا ہے۔

مدین سے ۹/۸ کلو میٹر کے فاصلے پر دریائے سوات' دریائے درال سے مل جاتا ہے' ان دو طوفانی دریاؤں کے سنگم پر بحرین کا خوبصورت قصبہ آباد ہے۔ ۴۵۰۰ فٹ بلند اس پہاڑی مقام پر سیاح دونوں دریاؤں کی شور مچاتی لہروں کے سنگم کا خوب لطف اٹھاتے ہیں اور ان کو تصاویر کے ذریعہ اپنے کیمروں میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ بحرین سے ۱۵ کلو میٹر دور ''کولائی'' سوات کا ایک اور خوبصورت قصبہ ہے۔ ۵۰۰۰ فٹ کی بلندی پر اس قصبہ سے کوہ ہندوکش کی ۱۹۰۰۰ فٹ بلند چوٹی مانکیال کا برف پوش دلفریب منظر نظر آتا ہے۔

مانکیال سے چند کلو میٹر دور کالام کا پہاڑی قصبہ ہے جو سطح سمندر سے ۶۸۰۰ فٹ بلند ہے۔ یہاں ''اوشو'' اور ''اتروت'' دو ندیاں یک جا ہونے سے قدرت کا حسن مزید نکھر جاتا ہے' مارخور' لومڑی' مرغابیاں اور دیگر حسین پرندے کثرت سے دیکھنے میں آتے ہیں' ندیوں میں مچھلیوں کا شکار بھی سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز رہتا ہے۔ کالام سے چھ کلو میٹر کے فاصلے پر ''اوشو'' ندی کا منبع ہے۔ سیاح یہ سفر پیدل طے کر کے ۱۹۴۵۰ فٹ بلند ''فلک سیر'' چوٹی کا نظارہ کرتے ہیں۔

وادی سوات میں قدم قدم پر قدرتی حسن سیاحوں کا دامن پکڑ کر روک لیتا ہے۔ ''کاراکر'' ''شانگلہ'' ''پیر بابا'' اور ''داگر'' اس وادی کے دیگر قصبے ہیں۔ سیدو شریف سے ۱۶ کلو میٹر کے فاصلے پر مالم جبہ Skiing کی برفانی پھسلن کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے' یہاں اب بڑے ہوٹل اور سیاحوں کی رہائش کے لئے بین الاقوامی معیار کے مطابق سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔ پاکستان کے دیگر علاقوں کی طرح سوات کی خوبصورت وادی میں بھی عشق کی لوک کہانیوں کا حوالہ موجود ہے' مقامی روایات کے مطابق یہاں کے ایک مقامی حکمران یوسف زئی قبیلے کے سردار حسن خان کا بیٹا آدم خان مردانہ حسن و وجاہت کا ایک نمونہ تھا' جو تمام وادی میں تیراندازی' گھڑسواری اور رباب کی موسیقی کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا۔

ایک دفعہ آدم خان کے گھوڑے کا نعل ٹوٹ گیا تو وہ اسے بستی کے ایک لوہار کے پاس لے گیا۔ جتنی

دیر لوہار نعل درست کرتا رہا' آدم خان ایک قریبی درخت کے نیچے بیٹھ کر رباب بجاتا رہا۔ رباب کی آواز سن کر قرب وجوار کے راہگیر اکٹھے ہوگئے۔ آدم خان کے ان سامعین میں وادی کی ایک حسین لڑکی درخانے بھی تھی۔ جب آدم خان کے گھوڑے کا نعل درست ہوا ' اور آدم خان کی نظر درخانے پر پڑی تو وہ پہلی نظر میں ہی گرفتار ہوگیا۔ حسن خان کو یہ جاننے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ اس کا بیٹا کسی کی محبت میں گرفتار ہے۔ اُس نے باتوں باتوں میں آدم خان سے درخانے کے بارے میں معلوم کیا اور آدم خان کے دو دوستوں' میراں اور بالو کو اس ذمہ داری پر متعین کیا کہ وہ درخانے کے گھر اور خاندان کے افراد کے بارے میں تحقیق کر کے حسن خان کو آگاہ کریں۔

دونوں دوستوں نے جلد ہی درخانے کے گھر کا پتہ لگا لیا۔ درخانے کا باپ طاؤس خان نے درخانے کی آدم خان سے شادی کو بے جوڑ خیال کرتے ہوئے رشتہ سے انکار کر دیا اور حسن خان کو بتایا کہ درخانے کی شادی ایک شخص پایو خان سے قرار پا چکی ہے' صرف رخصتی باقی ہے۔ آدم خان اس خبر سے بہت پریشان ہوا۔ اس نے ایک بوڑھی عورت کے ذریعہ درخانے کو پیغام بھیجا۔ جواب میں درخانے نے بھی آدم خان کے لئے اچھے جذبات کا اظہار کیا۔ اس رابطے سے آدم خان کی ہمت بندھی اور اس نے پایو خان پر زور دیا کہ وہ درخانے کو طلاق دے۔ پایو خان نے آدم خان کی زبردستی سے ڈر کر درخانے کو طلاق تو دے دی لیکن موقع پاتے پر درخانے کو اغواء کرلیا گیا۔ آدم خان کو درخانے کے اغوا کی خبر ملی تو وہ خود پر قابو نہ پاسکا اور موت کا شکار ہوگیا۔ دوسری طرف درخانے بیمار ہوگئی اور بستر سے نہ اٹھ سکی۔ پایو خان نے جب اندازہ لگایا کہ درخانے کے بچنے کی کوئی امید نہیں تو اس نے درخانے سے اس کی آخری خواہش پوچھی۔

درخانے نے اپنی آخری خواہش یہ بیان کی کہ آدم خان کے رباب پر آدم خان کی بجائی ہوئی کوئی دھن اسے سنائی جائے۔ پایو خان نے آدم خان کے دوستوں سے درخواست کی کہ وہ درخانے کیلئے آدم خان کے رباب پر کوئی دھن بجا دیں۔ آدم خان کے دوست میراں اور بالو' آدم خان کا رباب لے کر درخانے کے پاس پہنچے اور انہوں نے آدم خان کی ایک پسندیدہ دھن چھیڑی' موسیقی کی آواز سے درخانے کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آئی اور اسی مسکراہٹ کے ساتھ وہ دنیا سے رخصت ہوگئی۔ جب پایو خان کو معلوم ہوا کہ درخانے مر گئی ہے تو اس نے خود اسے سبز درہ میں آدم خان کی قبر کے برابر دفن کیا۔ سبز درہ میں آدم خان اور درخانے کی قبریں رباب بجانے والوں کیلئے خصوصی دلچسپی رکھتی ہیں اور تمام علاقہ سے رباب بجانے والے یہاں پہنچ کر رباب بجاتے ہیں' سبز درہ میں درختوں کی شاخیں رباب کا ساز تیار کرنے کیلئے بھی خصوصی شہرت رکھتی ہیں۔

افسانہ

پروفیسر سہیل اختر

غیرت کی صلیب

رات بھیگ چلی تھی۔گاؤں کے چوکیدار کی تیز و تند آواز شب کے پچھلے پہر کی خامشی اور سکوت کو تھوڑی دیر کیلئے متزلزل کیے دیتی تھی۔ دور کھیتوں میں گیدڑوں کی چیخیں تاریک رات کی وحشت کو اور بھی گھمبیر بنا رہی تھیں پچھلے پہر کا چاند ظلمت کی چوکھٹ پر سر پٹک پٹک کر مغرب میں غروب ہو چکا تھا اور بادلوں کے کالے کالے دیو ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی کو زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی ہڑپ کر رہے تھے۔

ظلمت و خاموشی کے اس عالم میں دور ٹیلے پر ایک سایہ سا نمودار ہوا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے وہاں رکا۔اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اتنے میں چوکیدار کی تیر کی سی آواز فضا میں گونجی اور وہ سایہ وہیں ٹیلے کی سرد ریت پر دراز ہو گیا تقریباً ایک گھنٹے تک اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی اب یوں لگتا تھا جیسے چوکیدار بھی تھک ہار کر کہیں نیند کی آغوش میں چلا گیا ہو۔ اتنے میں وہ سایہ پھر حرکت میں آ گیا اور ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔ جھاڑیوں میں سے گزر کر وہ اس پگڈنڈی پر ہو لیا جو گاؤں کو جاتی تھی تھوڑی ہی دیر میں وہ گاؤں کے قریب پہنچ چکا تھا اچانک آسمان پر بجلی چمکی اور اس کی روشنی میں وہ سایہ ایک لمبے تڑنگے آدمی کی شکل میں تبدیل ہو گیا وہ کوئی دیہاتی شخص نظر آ رہا تھا اس کے سر پر ایک میلی سی پگڑی بندھی ہوئی تھی گلے میں چاندی کا تعویز لٹک رہا تھا جسم پر کھدر کا لباس اور پاؤں میں دیسی جوتی تھی وہ چوکیدار اور کتوں کی نظروں سے بچتا بچاتا گاؤں میں داخل ہو گیا اور ایک خستہ اور کچے سے مکان کے سامنے پہنچ کر رک گیا اس نے بند دروازے کے ساتھ کان لگا کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ گھر کے مکین جاگ رہے ہیں یا پچھلے پہر کے خمار میں نیند کے مزے لے رہے ہیں لیکن اسے سوائے خراٹوں کے اور کچھ سنائی نہ دیا اس نے اپنی جوتیاں اتاریں اور آہستہ سے مکان کے اندر پھینک دیں اب وہ ایک جھٹکے کے ساتھ خود بھی دیوار پھاند چکا تھا وہ آہستہ آہستہ کمروں کی طرف چلنے لگا کمروں کے دروازے نیم وا تھے پھر اس نے ایک کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا تو دو آدمی سوئے ہوئے دکھائی دیئے وہ احتیاط سے پیچھے ہٹ گیا اور دبے پاؤں چلتے ہوئے اس نے صحن کے آخری کونے والے کمرے کا رخ کیا اس

نے دیکھا کہ وہاں ایک عورت گہری نیند سو رہی ہے اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا اور بڑی آہستگی کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا اور اس عورت کے سرہانے کی طرف بڑھ کر اس کی بکھری ہوئی زلفوں میں آہستہ آہستہ اپنی انگلیاں پھیرنے لگا اچانک اس عورت نے بستر پر جنبش کی اور آنکھیں کھول دیں اندھیرے میں کسی مرد کو اپنے قریب دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکلنے ہی والی تھی کہ اس شخص نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولا!

''زینو، زینو خاموش۔ دیکھو میں آ گیا ہوں''

اس کی آواز سن کر وہ عورت بجلی کی سی تڑپ کے ساتھ اپنے بستر پر اٹھ بیٹھی اور اپنی گداز بانہیں اس شخص کے گلے میں حمائل کر دیں اور ایک ایسے لہجے میں جس میں سسکیاں بھی تھیں اور خوشی کی لہر بھی اس نے کہا!

''شیرو میرے شیرو! تم آ گئے''

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ شیرو نے اپنے کرتے کے دامن سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا!

زینو مت آنسو بہاؤ۔ دکھوں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ میں جیل سے چھوٹ کر اب ہمیشہ کے لئے تمہارے پاس آ گیا ہوں........ ہمیشہ کیلئے ...... اور کبھی نہ بچھڑنے کے لئے''

یہ سنتے ہی زینو دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب ماضی کے دکھوں کی یاد اور حال کے انبساط کا طوفان تھم گیا تو زینو بولی!

''لیکن تمہاری رہائی میں تو ابھی دو مہینے باقی تھے''

''ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے دو ماہ کی معافی مل گئی ہے۔ اچھے رویے اور جشن آزادی کی خوشی میں''۔ شیرو نے چارپائی پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''مگر یہ تو بتاؤ کہ تم رات کی تنہائی میں اس طرح چوروں کی طرح گھر میں کیوں داخل ہوئے'' زینو شیرو کے ہاتھ اپنے ہونٹوں تک لاتے ہوئے بولی۔

''چوروں کی طرح؟ کیوں یہ میرا گھر نہیں کیا''۔ شیرو نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''وہ تو ہے لیکن اس طرح رات کے وقت ....''

''میں چاہتا تھا کہ اس طرح میں تمہیں اچانک حیرت زدہ کر دوں اور جب صبح کو گھر والے مجھے غیر

متوقع طور پر کمرے میں موجود پائیں تو ان کی حیرانی اور خوشی کی انتہا نہ رہے"۔ شیرو کے لہجے میں خوشیاں مچل رہی تھیں۔ پھر اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا

"اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ وہ پاجی نمبردار ابھی زندہ ہے یا مر گیا"

"وہ کمینہ" زینو کہنے لگی بڑا ہی سخت جان نکلا۔ تمہاری کدال کی ضرب نے اسے قبر تک تو پہنچا دیا تھا لیکن ڈاکٹروں نے اسے بچا ہی لیا تم دور میانوالی جیل کی سلاخوں کے پیچھے دن کاٹنے لگے اور وہ کم بخت آہستہ آہستہ صحت یاب ہوتا چلا گیا۔ اور ....

زینو آہستہ بولو آہستہ! شیرو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا کہیں گھر کے لوگ بیدار نہ ہو جائیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ وہ پاجی نمبردار اب تک جہنم رسید ہو چکا ہوگا۔ خیر اسے تو معلوم ہو ہی گیا ہوگا نا کہ ایک غیرت مند شوہر کی بیوی کو چھیڑنے کا کیا انجام ہوتا ہے........ سنو! یہ آہٹ کیسی ہے۔ شاید بھائی جاگ گیا ہے۔ دیکھو اگر وہ ہمارے کمرے میں آ جائے تو تم خاموش رہنا۔ میں بھی نہیں بولوں گا۔ قریب آ کر دیکھے گا تو کتنا حیران ہوگا!"

ابھی شیرو نے اپنا جملہ ختم ہی کیا تھا کہ دروازے کے کواڑ زور سے کھلے۔ تاریکی میں ایک شخص کا چہرہ دکھائی دیا اور ایک گرج دار آواز گونجی "زینو تو کس سے باتیں کر رہی ہے؟ کون ہے تیرے پاس"

زینو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کرخت آواز پھر گونجی

"بدکار عورت میرا بھائی تیری وجہ سے جیل کاٹ رہا ہے اور تو یوں راتوں کو غیر مردوں کے ساتھ گلچھرے اڑاتی ہے...... ذلیل عورت"

یہ سن کر زینو اور شیرو کے ہونٹوں پر ہلکی سے مسکراہٹ کھیلنے لگی اور وہ مسکراہٹ قہقہوں میں تبدیل ہونے ہی والی تھی کہ اسی لمحے رات کے پرسکون سناٹے میں یکے بعد دیگرے دو تیز دھماکے ہوئے اور چشم زدن میں دو معصوم جسم خون میں لت پت زمین پر تڑپنے لگے۔

افسانہ

محمود اختر سعید

نروان

آج نجانے کتنے برسوں بعد کچی حویلی کا زنگ آلود تالا کھولا گیا۔ دریائے گومتی کے کنارے آباد کشن گڑھ کے سرسبز و شاداب قصبہ کے سبھی بچے بوڑھے کچی حویلی کی طرف 'ودھائیاں' دینے چلے آ رہے تھے۔ سبھی کو حیرت تھی، چوڑیوں کی جھنکار اور آنگن میں کھیلتے ہوئے، بچے کو دیکھ کر ہر آنے والا خوش ہو رہا تھا۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی جو سنتا دوڑا چلا آتا۔

کئی سال پہلے کی بات ہے، کپل وستو کا شہزادہ گنگا دھر، گھر بار پر آخری بار پیار بھری نظریں ڈال کر نروان کی راہ پر چل نکلا تھا۔ کسی یار بیلی کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں چلا گیا۔ سال دو سال بعد یونہی سرسری سی خبر ملتی کہ گنگا دھر کسی تیرتھ پر نظر آیا تھا۔ مگر وہ تو غولِ بیابانی کی طرح جنگل جنگل پھرتا، حالوں بے حال، اداس تنہا، بھگوان جانے اسے کس گیان کا دھیان یوں بیابانوں میں لئے لئے پھر رہا تھا۔

ساوتری اس کے بچپن کی منگ تھی۔ اب تو وہ بھی اپنا بچپن بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ قدم اٹھاتی تو پائل کی جھنکار سن کر دیکھتی نگاہیں بس دیکھتی رہ جاتیں۔ مگر گنگا دھر نہ جانے کس مٹی سے بنا تھا، جس کا من ساوتری کی اٹھکیلیاں کرتی لوچ لچک پر کبھی نہ ڈولتا۔ ساوتری کے امنگوں بھرے دل نے پنگھٹ کو آتے جاتے کئی بار چاہا کہ اُس کا نندلال آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لے۔ وہ چھڑائے تو بھی نہ چھوڑے۔ یا کم از کم کنکر مار کر گھڑیا ہی توڑ دے۔ بولے یا نہ بولے۔ دیکھے یا نہ دیکھے۔ جوانی کی خاموش تپش تو محسوس کرے۔ مگر گنگا دھر حویلی کے باہر برگد کی چھایا تلے بیٹھا، نروان کی دھن میں مست الست رہتا۔ ایک روز ساوتری نے یونہی گزرتے گزرتے گنگا دھر کے تاؤ کا اندازہ کرنے کے لئے چھینٹا مارا۔

''گنگا دھر! دیکھ تو کون آیا ہے۔۔۔؟''

جواب نہ پا کر اس نے ذرا لچک کر پھر کہا۔

''گنگا دھر! میں ساوتری ہوں۔۔۔ تیری ساوتری۔۔۔''

پھر بھی جواب نہ پا کر ساوتری نے آگے بڑھ کر گنگا دھر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''۔۔۔دیکھ گنگا دھر' یہ جیٹھ ہاڑ جیسی سنسان زندگی۔۔۔''

ابھی ساوتری نے اُسے تنہا پا کر اپنا من بھی ہلکا نہ کیا تھا کہ گنگا دھر کچھ کہے سنے بغیر اُٹھ کر مندر کی طرف چل دیا' ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا کہ اُسے کون پکار رہا تھا۔

دراصل اُس نے اپنے چاچو رام داس کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ شادی نہیں کرے گا۔ اُسے صرف من کی شانتی چاہئے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ہر ایک کو یہی کہتا کہ

''۔۔۔شادی کا بندھن' نروان کی موت ہے' سکھ شانتی کے راستہ کی دیوار ہے۔ دکھوں کی پنڈ ہے۔''

اس کا چاچو رام داس اپنے بھتیجے کے بارے میں بہت فکر مند تھا۔ ہر ملنے والے کے سامنے ہاتھ جوڑتا کہ گنگا دھر کو سمجھاؤ۔ مگر وہ تو نہ جانے کس کپل وستو کا شہزادہ تھا' جسے نروان کی راہ پر چلتے اور کشٹ کاٹتے دس سال بیت گئے۔

کشن گڑھ ایک اچھا خاصا قصبہ تھا۔ دریائے گومتی کے کنارے' نئے زمانہ کی نئی نئی آفات سے دور یہاں کے باسی' آرام' چین اور آنند سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس قصبہ میں گنگا دھر کا خاندان اچھی خاصی جاگیر کا مالک تھا۔ بھگوان نے انہیں سب کچھ دے رکھا تھا۔ دھن' دولت' عیش آرام۔۔۔ سبھی کچھ تو تھا۔ ان کی شاندار حویلی' جو کسی وجہ سے دور و نزدیک' کچی حویلی' کے نام سے مشہور تھی' اس حویلی کے پاس سے گزرنے والے' حویلی کی چوکھٹ کو چھوئے بغیر نہ گزرتے۔ یہ بات مشہور تھی کہ بستی کے ضرورت مندوں کی بہت سی حاجتیں اس حویلی سے پوری ہو رہی تھیں۔ مگر حوادث زمانہ کہئے کہ اب اس حویلی کے وارثوں میں گنگا دھر اور اس کا چاچو رام داس ہی باقی بچے تھے۔ کچی حویلی کی خوشیوں کو وقت کی دیمک آہستہ آہستہ چاٹتی چلی گئی۔ رام داس نے لاکھ چاہا کہ جوان بھتیجا جلد گھر آباد کر لے۔ حویلی کی رونق لوٹ آئے۔ مگر گنگا دھر پر تو شانتی اور نروان کی دھن سوار تھی۔ اور وہ اپنی بے چین آتما لئے جنگل جنگل گھوم رہا تھا۔ ایک تیرتھ کو چھوڑ کر دوسرے تیرتھ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔

''بیٹا اپنا گھر آباد کر لے'' قصبہ کی ماسیوں اور چاچیوں نے سمجھایا۔

''یار! عمر نکل گئی' تو شادی کا مزہ کیا۔۔۔ نروان کی رٹ چھوڑ' ارمانوں کی سیوا کر۔۔۔'' یار بیلی بھی چٹکیاں لیتے۔

ادھر گنگا دھر کا چاچو رام داس' دوہرے غم کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ ایک طرف جوان بھتیجے کی اجاڑ زندگی کی چنتا' تو دوسری طرف رشتہ کی بھانجی ساوتری کے ماں باپ کے چہروں پہ لکھا سوالیہ نشان۔

ساوتری کے والدین جلد شادی کے لئے ہر طرح کا دباؤ ڈالنے کے بعد اب خاموش ہو گئے تھے۔ مگر رام داس تو ان کے چہروں پر لکھی غم کی تحریر پڑھ رہا تھا۔ بالآخر گنگا دھر کی طرف سے مایوس ہو کر رام داس نے اپنے ایک کاندھے کا بوجھ اتارنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ دوسرے گاؤں سے ایک گبھرو جوان آ کر ساوتری کو پالکی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گیا' کہنے کو تو رام داس نے دل پر پتھر رکھ کر اپنے ایک کاندھے کا بوجھ اتار دیا۔ مگر جوان بھتیجے کی منگ کی یوں رخصتی کے غم کو وہ برداشت نہ کر سکا۔ کچھ لوگوں کی باتوں نے بھی اسے وقت سے پہلے ہی مار دیا۔

کچی حویلی کے باہر برسوں سے لگا ہوا زنگ آلود تالا دیکھ کر گاؤں والوں کو بہت افسوس ہوتا۔ اس حویلی کے آنگن میں اگا ہوا برگد کا تناور درخت اپنے مکینوں سے بے نیاز موسم کے ساتھ ساتھ رنگ بدلتا رہا۔ کبھی بہار تو کبھی خزاں۔ مگر اس حویلی کے آنگن میں خزاں نے یوں ڈیرہ جمایا کہ بہار آنے کو کوئی آس امید نہ رہی۔ کوّں اور گدھوں کی کئی نسلوں نے برگد کی شاخوں اور پتوں پر سفیدی پھیر دی تھی۔ حویلی کا سونا آنگن بھوت پریت کا ڈیرہ بن کر رہ گیا تھا۔

اُدھر وقت اپنے پیچھے کئی کہانیاں چھوڑتا ہوا دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ گنگا دھر کا گیان دھیان سب چکر تھا۔ اسے ساوتری پسند ہی نہیں تھی۔ وگرنہ مرد اور شادی سے بھاگے۔۔۔؟ یہ بھی سننے میں آیا کہ جاگیر کے واحد وارث کو اُس کے چاچو رام داس نے ہی اپنے راستہ سے نہ ہٹا دیا ہو' اور یہ بات بھی خاصی مشہور تھی کہ وہ چکر دے کر جان بچا گیا' وگرنہ قتل کر دیا جاتا۔ مگر اب جبکہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کہانیوں کے الفاظ بھی مدھم ہوتے جا رہے تھے کہ وقت نے اچانک کروٹ بدل کر گاؤں کے سبھی باسیوں کو دنگ کر دیا۔

آج گاؤں کے مکھیا کی موجودگی میں کچی حویلی کا زنگ آلود تالا کھولا گیا۔ تیز بارش کے بعد جب ہلکی ہلکی دھوپ نکلی' تو قصبہ والوں کی محبت نے کچی حویلی کو دھنک کے رنگوں کی طرح گھیر لیا۔ بڑی بوڑھیاں گنگا دھر کی پتنی کو ڈھیروں دعائیں دے رہی تھیں۔ بچے بالے بھی جمع ہو گئے تھے۔ گنگا دھر بھی اپنے یار بیلیوں میں بیٹھا خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

"ماسی! یہ سب آپ کی دعاؤں کی برکت ہے۔" گنگا دھر بے حد خوش تھا۔

"یار! ہم نہ کہتے تھے۔ بیوی بچوں کے بغیر کہیں بھی سکھ شانتی نہیں۔"

یار بیلی اُسے پرانی باتیں یاد دلا رہے تھے۔

''ہاں بھئی تم ٹھیک ہی کہتے تھے۔ بیوی بچوں کے ساتھ ساتھ یار بیلی بھی سکھ شانتی کا حصہ ہیں۔'' گنگا دھر کے خیالات بالکل بدل گئے تھے۔

''چاچی! اپنے پوتے کو تو دیکھتی جاؤ'' گنگا دھر نے ایک بوڑھی عورت کو جاتے ہوئے روک کر متوجہ کیا۔
باہر آنگن میں برگد کا گھنا درخت آج کچی حویلی میں آنے جانے والوں کی سواگت کے لئے نئی سبز پوشاک پہنے کھڑا تھا۔ جس کے نیچے گنگا دھر کا راجکمار پرندوں کو دانا ڈال رہا تھا۔ اُس کی ماں حیرت اور خوشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

بستی کے لوگ بھی حیران تھے۔ کیوں نہ ہوتے؟ سب کچھ ہی تو بدل گیا تھا۔ کپل وستو کا شہزادہ اپنے دوسرے جنم کے ساتھ سکھ شانتی کی دولت سمیت گر نروان کے سنگھاسن پر براجمان تھا۔

تعاون کے لئے التماس

ہم اپنے محترم قلمی معاونین سے ملتمس ہیں کہ وہ اپنی نگارشات نظم و نثر یا تو ٹائپ شدہ صورت میں ارسال فرمائیں یا وہ قدرے احتیاط سے تحریر کریں۔ تاکہ پڑھنے میں دشواری نہ ہو کیونکہ ہماری انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ ''الاقرباء'' کے مندرجات اغلاط سے پاک ہوں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمیں آپ کا گرانقدر تعاون حاصل ہو۔ (ادارہ)

اختر علی خاں اختر چھتاروی

حمد باری تعالیٰ

"مصروفِ حمد جب کبھی میرا قلم ہوا"
تیرے کرم سے خامہء معجز رقم ہوا

تہلیل بر زباں ہے صریرِ ثنا گزار
اشکِ خضوع ، رشحہء عیشِ قلم ہوا

لوح و قلم کا مُوجد و مالک تُو ہی تو ہے
تیرے ہی قط سے خامہ ترے آگے خم ہوا

احساسِ بُعد قربتِ بے حد کا وہم تھا
ہرگز نہ التفات کبھی تیرا کم ہوا

ہر خارِ غم گُلاب ہوا تیرے ذکر سے
بے ذکر جو بھی لمحہ گیا اُس کا غم ہوا

تیرا ہی نور گنبدِ خضرا کا نور ہے
یہ نور لالہ زاروں میں شبنم کا نم ہوا

تو نے رکھا ہے نام محمد ﷺ حبیب ﷺ کا
تیری ثنا سے اِن ﷺ کا خجستہ قدم ہوا

پیدا کیا اور اُمتِ احمد ﷺ میں بھی رکھا
اُمت پہ اِن ﷺ کی تیرا کرم پر کرم ہوا

تیری ثنا کی فکر میں ، ہے رقص میں ثنا
ایک ایک حرف محوِ طوافِ حرم ہوا

اختر ، ہٹی ہے جیسے ہی اسباب سے نظر
تسکینِ جاں کا غیب سے ساماں بہم ہوا

سہیل اختر

نعت

قسمت میں ہو یا رب میری طیبہ کا سفر بھی
کھل اٹھے گلابوں کی طرح دل بھی نظر بھی

میں شب کا مسافر ہوں مگر پھر بھی کسی دن
مجھ پر چمک اٹھے تیرے کوچے کی سحر بھی

تُو اتنی بلندی پہ گیا ایک ہی پل میں
سورج بھی تیرا نقشِ کفِ پا تھا قمر بھی

لُکنت کے سوا کیا ہے وہاں مدح سرائی
آئے نہ کسی کام جہاں کوئی ہنر بھی

اس بزم میں جز آپ کے پہنچا نہ کوئی اور
وہ بزم جہاں جل اٹھیں جبریل کے پر بھی

لہراتے ہیں جس شاخ پہ چاہت کے شگوفے
اے رحمتِ کل اُس پہ لگے کوئی ثمر بھی

میں اس میں جو دیکھوں تیری صورت نظر آئے
اک آئینہ ایسا کہ تو ہے آئینہ گر بھی

تو وہ ہے کہ نظروں سے مقدر کو بدل دے
ہے منتظر لطف میرے دل کا کھنڈر بھی

عبدالعزیز خالد

مدحت خیر الانامؐ

ہوئے خصائل محمودہ جس میں جمع تمام — وہ سیّد بنی نوعِ بشر، وہ خیر انام

ہو جس کی مدحتوں کا سلسلہ نہ ختم کبھی — گو سلسلہ ہوا اس پر رسالتوں کا تمام

درود پڑھتے ہیں حور و ملائکہ جس پر — خدائے عرش بریں بھیجتا ہے جس کو سلام

وہ جس سے مہر میں کسب نور کرتا ہے — وہ جس سے روشنی لیتا ہے وامِ ماہ تمام

خمیر کونسی طینت سے جانے اس کا اٹھا — پرے ہے سرحد ادراک سے بھی جس کا مقام

عطائے رحمت پروردگار کا قاسم — ہیں جس پہ آئنہ اسرارِ قسمت قسام

ہوا نہ محسن انسانیت کوئی اس سا — کہ جس کے دین میں ہیں ہم کفو خواص و عوام

جو حکم سعی و صبوری کا دے یہ کہہ کے کہ ہے — ہر ایک کام کا منجانب خدا اتمام!

ہے جس کی سب تگ و دو خالصاً لوجہ اللہ — امیر معرکہ ء عشق، آگہی کا امام

"انا لہا" کی بشارت جو اہل حشر کو دے — وسیلہ جس کا ہے درکار بہرِ نیلِ مرام

بیاں میں آئیں نہ اس کے معارف و احوال — کہ بالمشافہ، جس نے کیا خدا سے کلام

ہے درجِ لوحِ مبیں صبحِ آفرینش سے — اس آفتاب جہاں تاب کا محمدؐ نام

محمدِؐ ہمہ ارض و سما، محمدِؐ ما — کہ ذات جس کی ہے عین عیون رحمت عام

مجید و ماجد و امجد، مُجید و جواد — اتم و اکمل و اکرم، کریم و کیفِ کرام

وہ غوث عالم و غیث ہمم، غیاث امم — وجود جس کا ہمہ تن کرامت و اکرام

مطیع و مخبت و مطواع جس کے کون و مکاں — وہ روح وقت رواں، کارگاہ کُن کا قوام

میں اس کے حق ثنا سے ہوں کیسے عہدہ برآ — حدیث پختہ چساں خیزد از قریحہء خام

عنایت ازلی ہے، یہ فیض لم یزلی — کہ تس پہ بھی ہوں میں اس کا ترانہ سنج مدام

قبولِ سمع ہو یا رب کلام غث و سمیں!

بہ بزم گاہِ فنا --- ضامن بقائے دوام

گفتار خیالی

مرے پیمبر ﷺ

مرے پیمبرؐ
حقیقتوں کے افق پہ زندہ ہے نام تیرا
ستارے تیرے۔۔قمر بھی تیرا۔۔نظام شمسی تمام تیرا
حریم سدرہ مقام تیرا
تو روشنی ہے۔۔تو زندگی ہے۔۔تو آگہی ہے
شعور انسانیت میں تیری ہدایتوں ہی سے روشنی ہے
ہے چار سو فیض عام تیرا
نگاہ و دل میں مقام تیرا
مرے پیمبرؐ
حد زبان و بیاں سے باہر ہیں وصف تیرے
میں تیری توصیف کیسے لکھوں
میں تیری تعریف کیسے لکھوں
مری عقیدت حرا کے پتھر سے اکتساب وفا کی خاطر
مرے تصور کو اذن ادراک دے رہی ہے
وہ سنگ اطہر کہ جس کی قسمت تیری نگاہ کرم رہی ہے
مرے پیمبرؐ۔۔۔
میں سوچتا ہوں کہ یہ مقدر کی یاوری ہے
کہ میں نے سوچا!
ترے تصرف میں آنیوالے ہر ایک عنصر کی منزلت کو
حرا کے ماحول پُر تقدس کی کیفیت کو
وہ میرے بے مایہ جسم خاکی سے بھی گراں ہے

ترے تقرب کا حسن احساس۔۔۔روح اس کی
کہ آج بھی وہ عقیدتوں کی نظر میں زندہ ہے جاوداں ہے
مرے پیمبرؐ
میں سوچتا ہوں
وہ ماورائی غلام تیرا
جو رفعت عرش کبریا ہے
پلک جھپکنے سے قبل غار حرا میں آ کر
خدا کا پیغام دے کے جائے
وہ کس قدر با نصیب ہوگا
حریم سدرہ کا راز داں وہ۔۔۔خدائے برتر کا ترجماں وہ
مثال قلزم ہے بیکراں وہ
مرے پیمبرؐ
تری قلمرو میں کائنات ایسی سلطنت ہے
جہاں کہ روح الامیں پیامی ہے مستحق تیری قربتوں کا
میں ایسا بھی باہنر نہیں ہوں
مگر میں پھر بھی یہ سوچتا ہوں
مری عقیدت کے خالی کشکول میں ہو سکہ تیرے کرم کا
جگا گیا ہے مرا مقدر
درود تیرا سلام تیرا
کہ نام تیرا پیام تیرا
قبول ہو یہ کلام تیرا

حبیب اللہ اوج

سلام بہ سرورِ کونینؐ

سلام اس پر خدا نے خود محمدؐ جس کو فرمایا!
سلام اس پر حبیبِ کبریا جس نے لقب پایا
سلام اس پر کہ جس کہ نام سے دل کو قرار آیا
سلام اس پر کہ ذاتِ حق پہ جس سے اعتبار آیا
سلام اس پر کہ جس سے قیصر و کسریٰ پہ تھی لرزش
سلام اس پر کہ جس پر ہوتی تھی انوار کی بارش
سلام اس پر کہ جس نے علم کی مشعل جلائی ہے
سلام اس پر کہ جس نے راہ عرفاں کی دکھائی ہے
سلام اس پر کہ جس سے کوئی بہتر ہو نہیں سکتا
بجز اس کے کوئی بھی داغ عصیاں دھو نہیں سکتا
سلام اس پر جہاں میں نورِ وحدت جس نے پھیلایا
سلام اس پر کہ جس کے جسمِ اطہر کا نہ تھا سایا
سلام اس پر یتیموں کو لگایا جس نے سینے سے
گلاب و مشک کی آتی تھی بُو جس کے پسینے سے
سلام اس پر کہ تھی الفقر و فخری زندگی جس کی
جہانوں کو منور کرتی تھی تابندگی جس کی
وہی جس نے خطاب رحمۃ للعالمینؐ پایا
کلام پاک لے کر عرش سے سوئے زمیں آیا
بلالیں اوج کو وہ جلد طیبہ کی بہاروں میں
بسر کرتا ہے جو دن رات بس اسکے نظاروں میں

توصیف تبسم

خونِ شہداء

(تضمین بر شعر عرفی شیرازی)

سب سے پہلے ہے سزا وار ثنا، ذات احد
مدح واجب ہے مگر کم ہیں حروف ابجد

یہ عناصر کا جہاں، آنکھ کا حیرت خانہ
دیکھتی جاتی ہے، ششدر ہوئی جاتی ہے خرد

سبز پتوں میں چھپی آگ، شرر پانی میں
آنکھ کس کو کرے تسلیم، کرے کس کو رد

بڑھتی جاتی ہے خلاؤں میں مسلسل یہ زمیں
وقت اک خطِ کشیدہ ہے، ازل ہے نہ ابد

جو دیئے بجھ گئے، روشن ہیں ہوا کے رخ پر
کربلا! معجزہ کس کا ہے حیات سرمد

ہے شہیدوں کا لہو طیّب و طاہر ورنہ،
کیوں اُنہیں کپڑوں میں رکھتے ہیں انہیں زیرِ لحد

ہے یہی حال یہاں ان کے عزا داروں کا
نعمت گریہ جنہیں دی گئی، اللہ الصمد!

"تو زیک قطرۂ خوں، ترک وضو گیری، ما
سیل خوں از مژہ ریزیم و طہارت نہ رود"

ڈاکٹر خیال امروہوی

حسین شناسی ☆

نشاط حرف سے پُر ہیں سماعتیں کیا کیا حسینیت نے عطا کیں علامتیں کیا کیا
صداقتوں کا صلہ ہیں عداوتیں کیا کیا ملیں نہ راہ انا میں جراحتیں کیا کیا

صنم پرست وفا کا نظام کیا جانیں
حسین ابن علی کا مقام کیا جانیں

اگرچہ عقل پہ ابلیسیت بھی طاری ہے صدائے حق کو دیا نا ازل سے جاری ہے
جہاں ہے نور وہاں کارگاہ ناری ہے جفا کے زہر کا تریاق جاںنثاری ہے

غم حسین میں دل کی نجات شامل ہے
فقط نجات نہیں کائنات شامل ہے

بلا کی دھوپ میں صحرا کی لُو معاذاللہ سرفرات تھے سوکھے سبُو معاذاللہ
کہیں شجر نہ کہیں برگِ نمو معاذاللہ ہر اک مقام پہ بکھرا لہو معاذاللہ

نگاہ وقت نے جو امتحان دیکھا ہے
کسی نے ایسا کہاں خاندان دیکھا ہے

حسین رہبر عالی وقار و دیں پرور بصیر و عادل و حماد و عبد مستظہر
اصیل باپ کا بیٹا عظیم ماں کا پسر گلوں کے رنگ میں بھی جسکے خون کا ہے اثر

جو سر بلند ہے نیچا کبھی نہیں ہوگا
حسین دوسرا پیدا کبھی نہیں ہو گا

حسینیت سے یزیدوں کو پاش پاش کریں نیا جہان نئے پاسباں تلاش کریں
جمود توڑ کے تخلیق ارتعاش کریں حسینیت کی حقیقت سبھی پہ فاش کریں

ہر اک قدم پہ عمل ایسا بے مثال ملے
کہ اپنی ذات ہی آئینہ کمال ملے

☆ زیر تصنیف مسدس سے اقتباس (ادارہ)

عبدالعزیز خالد

رباعیات

(۱)

پیدا کریں ماحول میں ہرگز نہ تناؤ
یکساں کریں ہر فردِ بشر سے برتاؤ
ہم روگ بسا ہیں کس لئے خواہ مخواہ
ہے بھاؤ کسی سے نہ کسی سے ہے ابھاؤ!

(۲)

اظہار کو بیتاب رہے سوز دروں
آتا ہے جو ذہن میں کہوں یا نہ کہوں؟
ہر وقت کسی اُدھیڑ بُن میں مصروف
بیکار ہوں گو، مگر تنگ فرصت ہوں!

(۳)

یہ عارضہ ہے کبر سنی سے مخصوص
(تصدیق کناں ہے حکمت جالینوس)
اک عرصے سے پنڈلیوں ٹخنوں میں
ہو چلتے ہوئے سخت کھنچاؤ محسوس!

(۴)

بتلائیں تو ماہرین۔ علم ابدان
ان ہی کے بقول قدرتاً بے درمان
جب جسم ہے خود مرمّتی پر قادر
معذور ہیں پھر جہاں تہاں کیوں انسان

(۵)

اک شکل تھی وہ بھی تر یا چلتر ہی کی
دے داد جسے عمرو کی عیاری بھی
کیسے آخرِ کار چھڑا لیتی ہے
یم دُوت سے ستیہ وان کو ساوتری!

(۶)

اک البیلی چھیل چھبیلی مُیار
مستی جسے حسن کی، جوانی کا خمار
جاگو مٹی، مدھ بھری، لبریز نگاہ
ڈالے جس پر بھی کرے اس کو سرشار!

(۷)

ہر راز فروبستہ ہو ان پر ظاہر
چاہے تو کہو خبیر چاہے مخبر
آتی ہے خدا کی وحی جب نبیوں پر
سننے کو ہوں روحیں شعرا کی حاضر!

(۸)

کہتے ہیں مسلمانوں سے جو کافر ہیں:
اترا ہے جو تم پہ اس کے ہم منکر ہیں!
ہر مذہب کہنہ ہو نئے کا دشمن
اور اس کے وجوہ ظاہر و باہر ہیں!

ڈاکٹر خیال امروہوی

دھنک رنگ

☆

ساغرِ مے کے تموج سے ارم ملتا ہے
سرِ موجود کے ہمراہ عدم ملتا ہے
قلبِ اضنام میں ملتا ہے خدا کا وجدان
فکرِ یزداں کے حجابوں میں صنم ملتا ہے

☆

وقارِ عصر ہیں اجلالِ انجمن ہم ہیں
جو شب کے قلب میں دھنس جائے وہ کرن ہم ہیں
قبائے اطلس و کمخواب کی حقیقت کیا
"انا" کے کہنہ لبادے میں بھی مگن ہم ہیں

☆

مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو کہ کہاں رہتا ہوں
تم وہاں آ نہیں سکتے میں جہاں رہتا ہوں
دن کو مستور ہوں اور شب کو ستارہ بردار
منبعِ مُشک کی مانند جواں رہتا ہوں

☆

روشنی اندھی ہوئی اندھیر ہی اندھیر ہے
جب تشخص مر گیا کیوں فاتحہ میں دیر ہے
اب کے اس انداز سے طوفاں ہے استحصال کا
ساحلِ عشرت پہ مفلس سیپیوں کا ڈھیر ہے

☆

عشقِ لاچار قرینہ ہے طلب گاروں کا
شوقِ اخراجِ ضرورت ہے پرستاروں کا
خلوتِ غیب کے محبوب پہ رونا دھونا
شغلِ ناداریٔ عرفان ہے بیکاروں کا

☆

پست ہمت نئے رستے پہ نہیں چل سکتا
بھیگ جائے جو فتیلہ وہ نہیں جل سکتا
جو بھی لمحہ ہے گزرتا ہے گذر جائے گا
اس کا جو بھی ہے اثر سر سے نہیں ٹل سکتا

☆

ہم نہ رنگینیٔ اجسام سے کد رکھتے ہیں
اور نہ وارفتہ مزاجوں سے حسد رکھتے ہیں
صحبتِ حسن کی خواہش ہے ہمیں بھی لیکن
قرب میں فاصلہ دیدار میں حد رکھتے ہیں

☆

ابتداء نقطہ ء آخر کی خبر دیتی ہے
خشک کھیتی بھی لگن ہو تو ثمر دیتی ہے
بے شعوری وہ بلا ہے جو نہیں دیتی نجات
بلکہ تہذیب کو امراض سے بھر دیتی ہے

اختر علی خاں اختر چھتاروی

خمریات

(۱)

اک لمحہ فقط ' لمحہ ء موجود ہے ساقی
مئے دے کہ یہی ساعتِ مسعود ہے ساقی
جو لمحہ ابھی گزرا ہے ' ماضی ہوا کب کا
وہ لمحہ جو آیا نہیں بے سود ہے ساقی

(۲)

حلقہ ترے میخواروں کا محدود ہے ساقی
شاید کہ یہی غایتِ بہبود ہے ساقی
بے خود جو ہمیشہ مجھے رکھے وہ عطا ہو
ہشیار تری بزم میں مردود ہے ساقی

(۳)

بس تیری رضا ہی مرا مقصود ہے ساقی
دامن میں ترے جنت موعود ہے ساقی
تر کر دے مئے ناب سے سجادہ و سبحہ
فردوس ریاکاروں پہ مسدود ہے ساقی

(۴)

ہر جلوہ یہاں شاہد معبود ہے ساقی
مشہود ہی مسجود ہے ' موجود ہے ساقی
اک جام پئے حُرمت پیمان اَلَست
انجامِ خرابات ہی محمود ہے ساقی

(۵)

ہر ایک نظر جانبِ معبود ہے ساقی
ہر سجدہ پئے عظمتِ مسجود ہے ساقی
ساقی بھی سُبو ' ساغر و میخوار بھی تو ہے
کیا اور بھی کوئی یہاں موجود ہے ساقی؟

(۶)

اب صدق و صفا دہر سے مفقود ہے ساقی
مخبوط ہر اِک حاسد و محسود ہے ساقی
اِک گھونٹ مداوا ہے مری آتش جاں کا
ہر سینہ تہاں خانہ ء نمرود ہے ساقی

عبدالعزیز خالد

☆

صحبت معنی نگاہاں ، راس آئی کب ہمیں
مرگِ ذوقِ آگہی کا نوحہ کس منہ سے پڑھیں
رکھے سرگرداں نہ کیوں ہم کو پریشاں مشربی
ہم ہیں وہ اہلِ جہاں آشوب گر سمجھیں جنھیں
اتریں ہر جنگاہ خیر و شر میں بے سازو براق
برسرِ پیکار و کیں ہر کیش و ملت سے رہیں
ہر زمانے میں رہے ہم پوچ بافان اہل
بسکہ ہونا تھا شمار افتادگان خاک میں
کون ہے شنوائے عرضِ بے قراری ہائے دل
چھیڑ کر ساز تظلم داد رس کی رہ تکیں
کچھ بھی حاصل ہو تہہ گردوں نہ بے سعی جنوں
سست پیمان و نسق تاوان غفلت کا بھریں
آبرو مندی سے جینے کی اگر ہے آرزو
ازسرِ نو اپنے اہداف و مقاصد طے کریں
تار دامان غم جاناں ہے وہ حبلِ متیں
تھامنے والے جسے آلام دوراں سے بچیں
سرفرازی جن کی ہو منظور ان کو اہل عرش
چشم حیراں ، جان سوزندہ ، دل بیتاب دیں
بُعد و قرب ان کو برابر ، ایکساں غیب و شہود
عاشقانِ باصفا دائم حضوری میں رہیں
نغز گوئی ہے تطابق مقتضائے حال سے
کیوں نہ خالد کے سخن کو اس کسوٹی پر کسیں۔

محشر زیدی

☆

حوصلہ نظر بجا ۔ مشغلہ ہائے غم کہاں
بے ترے التفات کے عشق بھی محترم کہاں
اُسکی عنایتوں سے ہوں ذرۂ آفتاب رنگ
میرا بھرم ۔ نگاہ دوست ۔ ورنہ مرا بھرم کہاں
شام طرب کے خواب ہی رہ گئے چشم شوق میں
اب وہ سرور و نکہت گیسوئے خم بہ خم کہاں
جشنِ بہار ہے بپا یا پس پردہ قتل گاہ
بڑھ کے حجاب الٹ سکے اتنا کسی میں دم کہاں
مُنتظر کرم ہوئے دونوں جہاں سے بے نیاز
دیکھ ہوائے لطف دوست اب کوئی آنکھ نم کہاں
ایک یہ حسن اتفاق دیکھ لیا ہے آپکو
اب دل ناصبور کو طاقت ضبط غم کہاں
لذتِ سوز عشق کی بوالہوسوں کو کیا خبر
آپ کے پیار کا بدل مسندِ کے وجم کہاں
اُف یہ سلوکِ باغباں برق بنی ہے پاسباں
ورنہ بہار باغ نے دیکھے تھے یہ ستم کہاں
ایک انا کے واسطے سینکڑوں حشر اٹھا لئے
طبع بشر کا اضطراب پھر بھی ہوا ہے کم کہاں
اے دلِ رمزآشنا ۔ رونقِ محفلِ حیات
تیرے ہی دم قدم سے ہے ۔ تو نہ ہوا تو ہم کہاں
دل میں پرستشِ جمال ۔ ظاہرا سب سے بیخبر
محشرِ حیلہ ساز تو مستحقِ کرم کہاں

اختر علی خاں اختر چھتاروی

☆

بیٹھے ہیں، تیرگی کو ہی، کُحلِ بصر کیے
مدت ہوئی، زیارتِ نورِ سحر کیے

ہم جیسے روشنی کے مگر قدر ناشناس
پھرتے ہیں، روشنی کی طرف، پشت سر کیے

مصنوعی روشنی کی تمازت میں، ہم نے خود
تاراج، اپنے ہاتھوں سے، اپنے نگر کیے

خود ہی اُگائے ہم نے صدا عسرتوں کے کھیت
الزام خستہ حالی کے غیروں کے سر کیے

شاید اس امر کا ہمیں احساس بھی نہیں
پودے لگے ہوئے تھے جو ہم نے شجر کیے

نسبت مگر ہے اُس ﷺ سے کہ جس نے جہاں ہے کیا؟
تسخیر، ایک اشارے میں، شمس و قمر کیے !!

سچ ہے، جبینِ دہر پہ، نقشِ دوام ہیں
تالیف، ہم نے ماضی میں، جو بھی ہنر کیے!!

چنگیزِ عصر اور حدیثِ غمِ جہاں !!
ہم بے کسی میں، سوئے فلک ہیں نظر کیے

ہم اُس ﷺ کے نام لیوا ہیں اختر خدا گواہ
پتھر دلوں میں جس نے، تواضع سے، گھر کیے

☆

پھر اُفق پر، دن کے سینے میں، اتر جائے گی رات
شمع کی ہمزاد بن کر، تا سحر جائے گی رات

کامدانی سے بھرے آنچل کی چلمن سے لگی
بھیگ کر شبنم میں، نکھرے گی، سنور جائے گی رات

کیوں ہراساں کر رہی ہے، سرخیِ شامِ فراق
جان پر بن جائے گی، لیکن گزر جائے گی رات

چھین لے گا ہوش تک تیرا تصور آج شب
پھر تری تصویر میں، سو رنگ بھر جائے گی رات

ہم سے اہلِ دل، اگر اُٹھ جائیں گے، تو ہوگا کیا؟
تیرگی کو اپنی لیکر، کس کے گھر جائے گی رات

کر دیئے مدھم کواکب، چودھویں کے چاند نے
چاندنی کی گود میں بالکل، ٹھٹھر جائے گی رات

آئی ہے بادِ صبا لیکر، شمیمِ عطر بیز
اپنے گیسو، دن کے دامن پر، کتر جائے گی رات

آرزوئے بوسۂ خاور میں، نقدِ جاں بکف
ایک بوسہ کے عوض، جاں سے گزر جائے گی رات

رات، خود سرگرداں رہتی ہے، تلاشِ صبح میں
کل پھر آ جائے گی اختر، آج اگر جائے گی رات

ڈاکٹر خیال امروہوی

☆

حریف جبر بنونگا کہاں کہاں تنہا
کہ میرے ساتھ ہے لے دیکے میری جاں تنہا

بہار نے بھی ہلاکت میں گل کھلائے ہیں
نفاذ مرگ میں شامل نہیں خزاں تنہا

مجھے تو اپنے ہی قامت نے باندھ رکھا ہے
وگرنہ سر پہ اٹھا لوں میں آسماں تنہا

عروج عزم کا ادنیٰ سا معجزہ یہ ہے
کھلا رہا ہوں بیاباں میں گلستاں تنہا

غبار جہل سماعت سے اٹ گیا لیکن
صدائے خاص میں دیتا رہا اذان تنہا

یہ کس لطیف سحر کا ہے انجذاب طلب
مہیب شب میں چلا ہوں کشاں کشاں تنہا

نصاب اجر مشیت کو حفظ کر لیجئے
کہ اب حضور کو دینا ہے امتحاں تنہا

توصیف تبسم

☆

رستے بھی، مسافر بھی اک راز ہیں سر بستہ
پھر بھی سبھی چلنے کو بیٹھے ہیں کمربستہ

محدود حواس اپنے، مفقود خبر اپنی
کھلتی ہی نہیں ہم پر یہ راہِ سفر بستہ

باہر سے مکینوں کو خود ہم نے پکارا تھا
اندر بھی ہمیں تھے جو بیٹھے رہے دربستہ

جو وقت دکھاتا ہے سو دیکھتے جاتے ہیں
اس بزمِ تماشا میں بیٹھے ہیں نظر بستہ

بخشا شہ خوباں نے وہ خلعت بیتابی
یہ اشک مسلسل ہے اک سلک گہر بستہ

جیسے وہ قد بالا، اک نخل ثمرور تھا
دیکھا نہ کوئی ویسا، خوش قامت و بربستہ

یہ لوح و قلم تجھ سے، یہ حرف عطا تیری
مجھ پر بھی ذرا وا کر یہ باب ہنر بستہ

خیال آفاقی

☆

راہ عدم میں کیسا حوالہ وجود کا
دیکھا ہے ہم نے خوب تماشہ وجود کا

دیکھو تو ہر لباس یہاں بے وجود ہے
سمجھو تو ہر وجود ہے پردہ وجود کا

میری فنا بھی میری بقا کا ہے اک ثبوت
یعنی ہے خود وجود تقاضہ وجود کا

بکھری ہو جیسے روح میں رنگینیٔ حیات
کرتی ہو جیسے روح نظارہ وجود کا

بے شک خطا ہوئی تھی مگر وہ خطا ہوئی
جس نے بنا دیا ہے بہانہ وجود کا

محمود کائنات تھا مسجود اولیں
انسان بن کے رہ گیا بندہ وجود کا

روتی تو ہو گی خون کے آنسو کبھی کبھی
چشم عدم بھی دیکھ کے چہرہ وجود کا

عرشی کو کب نصیب مرا طرز بندگی
ہے روح کی نماز تو روزہ وجود کا

سانسوں کے زیر بار ہے اب تک مری حیات
شاید ہے میری روح پہ قرضہ وجود کا

اندر سے دے رہا ہے کوئی پھر مجھے صدا
ہے پھر زبان روح پہ نغمہ وجود کا

لگتا ہے جیسے ختم ہوا چاہتا ہے کھیل
گرنا ہی چاہتا ہے یہ پردہ وجود کا

تعمیر نو کے نام پہ ذہن جدید نے
دھندلا دیا ہے اور بھی چہرہ وجود کا

سمجھا دیا وجود و عدم کو خیال نے
آب رواں پہ کھینچ کے نقشہ وجود کا

سید رفیق عزیزی

☆

خار و خس میں گل و گلزار ہوئے بھی تو کیا
تیرا آئینۂ رخسار ہوئے بھی تو کیا

ورنہ معمورۂ انوار ہے ساری دُنیا
دل میں پیدا اگر انوار ہوئے بھی تو کیا

جل گئے آتشِ گل ہی میں ہزاروں غنچے
ہم شہیدِ رہِ پُرخار ہوئے بھی تو کیا

حرفِ حق زیست کو پروان چڑھا دیتا ہے
جسم نذرِ رسن و دار ہوئے بھی تو کیا

تیرا انکار ہی ممکن ہے، نہ اقرار ہی سہل
حرف و آواز کے اظہار ہوئے بھی تو کیا

ماحصل ذوقِ تکلم کا تمہیں تم ٹھیرے
ہم اگر صاحبِ گفتار ہوئے بھی تو کیا

جب نہیں تیرے سوائے کوئی مقصودِ طلب
ہم فقط تیرے طلب گار ہوئے بھی تو کیا

آبرو مند بہرحال ترا عشق رہا۔۔۔
ہم جو رُسوا سرِ بازار ہوئے بھی تو کیا

غایتِ عشق ہیں سرکار ہی سرکار رفیق
لاکھ ہم عاشقِ سرکار ہوئے بھی تو کیا

محشر زیدی

☆

حوصلہ نظر کجا ۔ مشغلہ ہائے غم کہاں
بے ترے التفات کے عشق بھی محترم کہاں

اُسکی عنایتوں سے ہوں ذرۂ آفتاب رنگ
میرا بھرم۔ نگاہ دوست۔ ورنہ مرا بھرم کہاں

شام طرب کے خواب ہی رہ گئے چشم شوق میں
اب وہ سرور و نکہت گیسوئے خم بہ خم کہاں

جشنِ بہار ہے بپا یا پسِ پردہ قتل گاہ
بڑھ کے حجاب الٹ سکے اتنا کسی میں دم کہاں

مُنتظر کرم ہوئے دونوں جہاں سے بے نیاز
دیکھ ہوائے لطف دوست اب کوئی آنکھ نم کہاں

ایک یہ حسن اتفاق دیکھ لیا ہے آپکو
اب دل ناصبور کو طاقت ضبط غم کہاں

لذتِ سوز عشق کی بوالہوسوں کو کیا خبر
آپ کے پیار کا بدل مسندِ کے و جم کہاں

اُف یہ سلوکِ باغباں برق بنی ہے پاسباں
ورنہ بہار باغ نے دیکھے تھے یہ ستم کہاں

ایک اَنا کے واسطے سینکڑوں حشر اٹھا لئے
طبع بشر کا اضطراب پھر بھی ہوا ہے کم کہاں

اے دلِ رمزآشنا۔ رونقِ محفلِ حیات
تیرے ہی دم قدم سے ہے۔ تو نہ ہوا تو ہم کہاں

دل میں پرستشِ جمال۔ ظاہرا سب سے بیخبر
محشرِ حیلہ ساز تو مستحقِ کرم کہاں

مشکور حسین یاد

☆

زمانہ کیا ہے؟ غم معتبر کا پس منظر
شعور کی تپش تازہ تر کا پس منظر

میں کس تلاش میں ہوں کس تلاش میں نکلوں
ہوا ہے گھر ہی میں گم میرے گھر کا پس منظر

میں اپنے ساتھ ہوں تاریخ کے حوالوں سے
ابھی سفر میں ہے میرے سفر کا پس منظر

میں اپنے آپ سے بے وجہ ڈرتا رہتا ہوں
نہ کوئی خوف نہ خوف وخطر کا پس منظر

وہ اپنے آپ کو ایجاد کرتا رہتا ہے
وہ اپنے آپ ہے اپنے ہُنر کا پس منظر

وہی تو لوگ ستاروں کے ہاتھ دیکھتے ہیں
جنہیں نصیب ہوا دوپہر کا پس منظر

سوائے نور کے مشکور کچھ نہیں رہتا
مقام شر سے نکل کر شرر کا پس منظر

پرتو روہیلہ

☆

فقیر خیر ہیں ہم طبع سادہ رکھتے ہیں
عدو سے بھی طلب استفادہ رکھتے ہیں

مروتوں کی روایات ' واسطے سب کے
توقعات سے کافی زیادہ رکھتے ہیں

ہمارے سامنے رہتی ہے منزلِ مقصود
ہم اپنے خواب میں بھی اپنا جادہ رکھتے ہیں

مقیم سایہ پندار ہیں ' گھڑی دو میں
روانگیٔ سفر کا ارادہ رکھتے ہیں

ہماری فکر ' عبارت ہے ذہن سے اپنے
ہم اپنے جسم پہ اپنا لبادہ رکھتے ہیں

مجال کیا ہے کہ شہ بھی کرے رخ بے جا
کہ ہم وزیر سے آگے ' پیادہ رکھتے ہیں

مگر نشہ ہے کہ نسلوں کو چڑھتا جاتا ہے
نہ جام رکھتے ہیں پرتو نہ بادہ رکھتے ہیں

مضطر اکبرآبادی

☆

خود کو حد درجہ خاکسار بنا
صرف اپنا یہی شعار بنا

جب بھی آئے خزاں چمن میں ترے
تو اسے موسم بہار بنا

ہر کوئی کب بھلا ہے اس قابل
ہر کسی کو نہ راز دار بنا

مجھ سے کچھ اور جب بنا نہ گیا
میں تری راہ کا غبار بنا

اپنے ماضی کو بھی نظر میں رکھ
اپنا فردا بھی شاندار بنا

تلخیوں کو حلاوتوں میں بدل
ناگواری کو خوشگوار بنا

بھر دے پھولوں سے دشت کا دامن
ریگ زاروں کو لالہ زار بنا

جسے معراج فن کہا جائے
خونِ دل سے وہ شاہکار بنا

لاکھ ناساز گار ہوں حالات
تو مگر ان کو سازگار بنا

حادثوں کی مزاحمت کے لئے
اپنے گرد اک نیا حصار بنا

سرور انبالوی

☆

جذبے کی لو کو میرے جنوں نے چھوا تو ہے
اتنا ہوا وہ خواب میں آ کر ملا تو ہے

برفاب کے جگر سے دھواں سا اُٹھا تو ہے
پتھر کی سِل پہ پیار کا پودا اُگا تو ہے

وہ دشمنی کے ساتھ سہی دیکھتا تو ہے
ہم مطمئن کہ اُس سے کوئی رابطہ تو ہے

صحرا کی تشنگی کو بجھانے کے واسطے
مدت کے بعد ابر کا ٹکڑا اٹھا تو ہے

شاید نسیم زلف معنبر کو چھو کے آئے
اُس کی طرف کو دل کا دریچہ کھلا تو ہے

دشمن وہ جان کا ہے مگر اُس کے واسطے
میرے لبوں پہ آج بھی حرف دعا تو ہے

یہ رات تیرے ہجر کی بھی کٹ ہی جائے گی
دن بھی تری جدائی کا آخر کٹا تو ہے

فرزیں کے آگے پیادے کی جرأت تو دیکھئے
دو گام ہی سہی مگر آگے بڑھا تو ہے

قاتل نے قتل کے نہیں چھوڑے نشاں تو کیا
اُس کے بدن پہ خون سے رنگیں قبا تو ہے

ڈوبے سرور لاکھ ستارے تو کیا ہوا
روشن چراغ ظلمتِ شب میں ہوا تو ہے

منصور عاقل

☆

لنڈھائے رندوں نے پھر ساغر شراب تمام
وہ زلف بکھری کچھ ایسے' بنی سحاب تمام

وہی ہے قصرِ دل و جاں پہ حکمراں اب تک
وہ سروقد کہ تھا اک پیکر شباب تمام

شعاع و شعلہ کو کیا دیکھتی نگاہ کہ جب
جھلس گیا تپشِ جلوہ سے نقاب تمام

خوشا وہ جن میں سلیقہ طلب کا تھا ورنہ
صدا بلب تھے گدایانِ بار یاب تمام

زہے نصیب کہ یہ انتخاب حسن کہ ہے
یہ فیض گل بدناں حسن انتخاب تمام

رہین پیش و پسِ درمیاں رہے کیا کیا
نظر اٹھی تھی کہ اٹھتے گئے حجاب تمام

وہ کور چشم ہیں عاقل جنہیں دکھائی نہ دے
وہ آفتاب سراپا' وہ ماہتاب تمام

☆

آج پھر لکھئے غزل عاقل قلم برداشتہ
اک نشاط انگیز مصرع اک الم برداشتہ

برہم و ابرو کشیدہ، شعلہ رنگ و خشمگیں
پھر کوئی آیا نظر تیغ دو دم برداشتہ

منحصر جانِ حزیں ہی پر نہ تھی غم ماندگی
ناتواں دل بھی بلا کا تھا ستم برداشتہ

پیروی غالب کی کیا کرتے بجز ایں قدر ہم
صبحدم نکلے بیک گوشِ قلم برادشتہ

کس نے یہ ارض و سما کے کردیئے سب راز فاش
میکدے میں کون آیا جام جم برداشتہ

کون جانے دل کی عظمت کون سمجھے دل کی بات
دل ہے سینہ میں کہ سینہ ہے حرم برداشتہ

آپ عاقل اتنے دل برداشتہ کیوں ہوگئے
ہم بھی یہ بار الم ہیں بیش وکم برداشتہ

محمود رحیم

☆

حادثے جس قدر بہم ہوں گے
سب مرے تجربوں میں ضم ہوں گے

تیری چاہت میں جتنے غم ہوں گے
وہ بہر طور کم سے کم ہوں گے

دشتِ جاں میں تری طلب میں رواں
ہو نہ ہو اور کوئی ' ہم ہوں گے

منزلیں بھی اُسی طرف ہوں گی
جس طرف آپ کے قدم ہوں گے

تیری آنکھوں میں گردشوں کی بجائے
آہوانِ ختن کے رم ہوں گے

وہ گھڑی بھی عطا کر اے جاناں
جس گھڑی ہم بھی محترم ہوں گے

سہیل اختر

☆

وہ ناداں رسم وراہ شوق کی عظمت کو کیا سمجھے
جو تیرے کاکل پیچاں کو بھی زنجیر پا سمجھے

شب وعدہ تصور کی فسوں کاری کا کیا کہیے
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے

ہمیں دیوارودر پر تیرا ہی چہرہ نظر آیا
سکوت شام ہجراں کو بھی ہم تیری صدا سمجھے

مہکتا ہے چمن کی بزم میں جو اک گل رنگیں
وہ برگ زرد کی محرومیوں کا کرب کیا سمجھے

وہ جس کے سامنے آواز بھی دم توڑ دیتی ہے
مرے ہونٹوں کی لرزش کا وہ کیسے مدعا سمجھے

کہاں کی سرفرازی اس کے شہر ناز میں اختر
جو اپنے سربلندوں کو بھی اپنی خاک پا سمجھے

ارشد محمود ناشاد

☆

طلبِ غیر میں جو خود کو بھلائے ہوئے ہیں
جانے کس خاک سے وہ لوگ اُٹھائے ہوئے ہیں

پھیلتا جاتا ہے اک سایۂ ظلمت، پھر بھی
دل کی قندیل تو ہم کب سے جلائے ہوئے ہیں

اِن پہ اب رنجِ سفر کھینچنا ہو گا تجھ کو
یہ تو وہ رستے ہیں جو تیرے دکھائے ہوئے ہیں

اب رہائی تجھے ہم سے نہیں ملنے والی
زندگی ! تو نے بہت زخم لگائے ہوئے ہیں

حاصلِ عشق نہیں کچھ بھی بہ جز داغِ وفا
ہم یہی بارِ گراں مایہ اٹھائے ہوئے ہیں

بندشِ ضبط ذرا دیر کی مہلت دے دے
اشک اب آنکھ کی دہلیز تک آئے ہوئے ہیں

جن کے ذروں کو بھی سورج کا سلام آتا ہے
ہم انہی راہ گزاروں کے ستائے ہوئے ہیں

ہوسِ راحت و عشرت نہیں کھینچی ہم نے
ہاں ترا درد، کہ سینے سے لگائے ہوئے ہیں

علی احمد قمر

☆

تعلق اک فسانہ ہو گیا ہے
انہیں دیکھے زمانہ ہو گیا ہے

نگاہ و دل میں جب سے بس گئے وہ
معزز یہ گھرانہ ہو گیا ہے

گلستاں کھل اُٹھے یادوں کے اس پر
یہ زخم اتنا پرانا ہو گیا ہے

کوئی آواز شامل ہے فضا میں
کہ ہر موسم سہانا ہو گیا ہے

گلی آباد اُس کی ہو گئی ہے
ہمارا آنا جانا ہو گیا ہے

اسے کہنا شکست نارسائی
تغافل تازیانہ ہو گیا ہے

اسے مل کر بھی کم ہونے نہ پایا
یہ غم اتنا توانا ہو گیا ہے

قمر اس شہر نا پرساں سے شاید
مسافر تھا روانہ ہو گیا ہے

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

☆

آسماں سے اس طرح پانی کبھی برسا نہ تھا
شہر کے لوگوں پہ ایسا حادثہ گزرا نہ تھا

گھر میں یوں سیلاب کا ریلا کبھی آیا نہ تھا
کوچہ و بازار میں پانی کہیں تھمتا نہ تھا

سر سے اونچا ہو چلا پنی کبھی کہتے رہے
شور لوگوں نے کیا اتنا کوئی سنتا نہ تھا

پاؤں میں پانی کی بیڑی ڈال کر پُروا چلی
میں قدم رکھتا کہاں باہر کوئی رستا نہ تھا

فصل کے بدلے زمیں سے یاس کے پودے اُگے
بیج ساون میں مگر ایسا کوئی بویا نہ تھا

دے گیا سیلاب گدلا آئینہ جاتے ہوئے
اپنا چہرہ اس قدر میلا کبھی دیکھا نہ تھا

ابر کے ٹکڑوں پہ برکھا رت نے کیا لکھا حسن
سر پہ یوں سیل بلا ہو گا کبھی سوچا نہ تھا

نورالزماں احمد اوج

☆

امید کے صحرا میں خیالوں کی طرح آ
اے جان غزل آ تو غزالوں کی طرح آ

تاریک ہوئی جاتی ہے دنیائے تصور
ان تیرہ فضاؤں میں اجالوں کی طرح آ

مشتاق نظارہ کہیں مایوس نہ ہو جائیں
اے زہرجبیں زہرجمالوں کی طرح آ

ہیں مرے خیالات پریشاں کئی دن سے
لہراتے ہوئے دوش پہ بالوں کی طرح آ

اے اوجؔ محبت کا سفر سہل نہیں ہے
اس دشت میں گر آ تو جیالوں کی طرح

ظفر اکبر آبادی

☆

وہ دل جس میں گداز غم نہ ہوگا
کسی پتھر سے ہرگز کم نہ ہوگا

لگی ہوگی غرض کی چھاپ جس پر
کبھی وہ رشتہ مستحکم نہ ہوگا

کرے گا کون میری غمگساری
اگر تو بھی شریکِ غم نہ ہو گا

جھکیں گے سر اسی اک سر کے آگے
جو کٹ جائے گا لیکن خم نہ ہوگا

بچھڑ کر اس سے یوں لگتا ہے جیسے
کوئی موسم مرا موسم نہ ہوگا

جلاؤ دل کہ پھیلے کچھ اجالا
چراغوں سے اندھیرا کم نہ ہوگا

ظفرؔ یہ عمر پھر کیسے کٹے گی
جو سمجھوتہ کوئی باہم نہ ہوگا

گفتار خیالی

☆

بدن کی سلطنت کو یوں تباہی کون دیتا ہے
محاذ جنگ پر اپنے سپاہی کون دیتا ہے

کہ جب مقتول کے ہاتھوں پہ اپنے خوں کے دھبے ہیں
یہ حالت ہو تو ایسے میں گواہی کون دیتا ہے

"ہما" نا اہل لوگوں کے سروں پہ سایہ افگن ہے
خداوندا یہ اذنِ کجکلاہی کون دیتا ہے

جہاں پر جرم کرنا بھی سبب ہو سرفرازی کا
وہاں از خود ثبوت بیگناہی کون دیتا ہے

جو خود مسموم کر لیتا ہے اپنے گھر کی دنیا کو
اُسے موج نسیم صبح گاہی کون دیتا ہے

محبت ہے تو دیتا ہوں تجھے بھی نور جذبوں کا
وگرنہ اس طرح روشن نگاہی کون دیتا ہے

وہاں گفتار میری صف میں کچھ نادیدہ دشمن تھے
وگرنہ چاٹگام و راجشاہی کون دیتا ہے☆

☆ سقوط مشرقی پاکستان کی طرف اشارہ

تسنیم کوثر

☆

دُکھ جدائی کے بھی قربت سے مٹانا چاہے
دل ترے پیار میں جینے کا بہانا چاہے

جان پر کھیل گئے ضبط محبت کے لئے
اشک اپنے نہ مگر ہم نے دکھانا چاہے

ہم نے جب سیکھ لیا جینا جُدا ہو کر بھی
کیوں وُہ خوابوں میں ہمیں آ کے ستانا چاہے

دل کی ہٹ دھرمی نے طوفان اٹھا رکھا ہے
نا سمجھ اب بھی وہی ساتھ پرانا چاہے

درگزر کرنا خطاؤں سے ہمیں آتا ہے
صبح کا بھولا اگر شام کو آنا چاہے

سب ہی قائل ہیں تیرے حسن نظر کے تسنیم
تو جسے چاہے اُسے سارا زمانا چاہے

☆

خواب، جگنو، ستارا آنسو ہیں
زیست کا استعارا آنسو ہیں

دل سمندر ہے اور سمندر کا
بھیگا بھیگا کنارا آنسو ہیں

تنہا تنہا اُداس شاموں میں
ساتھ دیتے ہمارا آنسو ہیں

جس میں بہتا ہے حسرتوں کا لہو
ایسا ہی ایک دھارا آنسو ہیں

شب تنہائی کے اندھیروں میں
کہکشاں کا نظارا آنسو ہیں

چاہ خوشیوں کی سب کو ہے تسنیم
کب کسی کو گوارا آنسو ہیں

تبصرہ کتب

امین راحت چغتائی۔محمود اختر سعید

نقد و نظر

کتاب : "روشنی چراغوں کی"

مصنف : صادق نسیم

ناشر : عکاس پبلی کیشنز۔اسلام آباد

ضخامت : ۳۳۸ صفحات قیمت: ۴۰۰ روپے

مبصر : امین راحت چغتائی

خاکہ نگاری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ کردار کا بھیتر بھاتر ایک ہو جائے اور وہ خاکہ نگار کے ہتھے چڑھا رہے مگر خاکہ نگاری کا ایک وصف یہ بھی ہونا چاہیے کہ خاکہ نگار خود کردار کے ہتھے چڑھا ہوا نظر آئے بس صادق نسیم کے خاکے کچھ اسی قسم کے ہیں اور ایسا تب ہوتا ہے جب کردار جاندار ہو اور خاکہ نگار سے نبرد آزما ہونے کی قدرت رکھتا ہو صادق نسیم نے بھی کردار قصداً ایسے ہی چنے ہیں مثلاً قائد اعظمؒ، علامہ اقبالؒ، حسرت موہانی، ظفر علی خان، عبدالمجید سالک، پطرس بخاری، ذوالفقار علی بخاری ایک طرف اور عبدالعزیز فطرت، عبدالحمید عدم، مظہر گیلانی اور شوکت واسطی دوسری طرف یہ سبھی کردار آ بیل مجھے مار کا وصف رکھتے ہیں خاطر غزنوی، محسن احسان اور ظفر علی راجا کا ذکر بعد میں کر رہا ہوں کہ یہ حضرات "جا بیل۔اُسے مار" کے اوصاف حمیدہ میں ملبوس ہیں بس ایک کردار ایسا ہے جہاں خاکہ نگار پھنس گیا ہے اور وہ ہے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا، یہاں وہ خود ایوب خاں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔

لیکن یہ خاکے نہیں مضامین ہیں کتاب کا نام ہے "روشنی چراغوں کی"

علامہ اقبالؒ کی رحلت کے وقت صادق کا سن پندرہ برس کا تھا لیکن اس کے لئے "یہ جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن" نہیں تھے۔اس کے دل و دماغ پر ایسے تاثرات مرتب ہو رہے تھے جو اس کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو بڑی سرعت سے نکھارنے کا باعث بنے۔

جامع مسجد روڈ راولپنڈی پر شہر کی سب سے بڑی مسجد واقع ہے اس کے صدر دروازے کی طرف

رخ کر کے دائیں طرف نگاہ اٹھائیں تو حکیم عبدالخالق کا شاہی دواخانہ تھا۔ یہ بھی راولپنڈی کا سب سے بڑا دواخانہ تھا (جو قیام پاکستان کے بعد مسجد کے بالمقابل اپنی نوتعمیر شدہ پرشکوہ عمارت میں منتقل ہو گیا تھا) نماز فجر کے فوراً بعد دواخانے کے برآمدے میں مریضوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے تھے۔

مسجد کے صدر دروازے کے بائیں طرف مسجد کی ہی دکانوں میں ایک نیم تاریک مختصر سی دکان میں حکیم محمد یحییٰ خاں شفا مرحوم کا مطب تھا سانولے رنگ کے باوقار چہرے پر عینک کے پیچھے دو بڑی بڑی روشن آنکھیں ایک ہی نظر میں "اسباب وعلل" سے آگاہ ہو جاتی تھیں۔ یہاں روحانی وجسمانی مریض دونوں ہی آتے تھے مگر کم کم۔ اسی حکیم سے صادق نسیم نے حکیم الامتؒ کی بانگ درا سبقاً پڑھی تھی۔ حکیم محمد یحییٰ خاں شفا کے درس نے دل میں علم کی جو شمع جلادی تھی اسی کی روشنی میں صادق نسیم نے اسّی برس طے کر لئے اور آج جب اپنی پیرانہ سالی میں اس نے زیر نظر مضامین سپرد قلم کئے تو وہ حکیم محمد یحییٰ خان شفا کو بھولا نہیں کہ اسی سرچشمہ علم وفضل سے قتیل شفائی بھی سیراب ہوا اور احمد ظفر بھی۔

صادق نسیم نے علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ پر اپنے مضامین مطالعے کے سہارے لکھے ہیں لیکن بڑے شگفتہ انداز میں اس نے مختلف مشہور واقعات ولطائف کو مرتب کرتے وقت اس بات کا بطور خاص خیال رکھا ہے کہ صرف انہی واقعات کو پیش کیا جائے جو ان دو نابغہ شخصیتوں کی سیرت وکردار سے مربوط ہوں اور ان کی طبعی شگفتگی کے بھی غماز ہوں۔

مولانا حسرت موہانی پر مضمون بھی بڑے دلاویز انداز میں ان کی خاکہ نگاری کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ مضمون ان کے راولپنڈی میں ایک مشاعرہ پڑھنے اور وہاں سے ملنے والے پانچ سو روپے یتیم خانہ فیض الاسلام کو ادا کرنے کے متعلق ہے یہ مضمون انوکھا بھی ہے کہ اس واقعے کے حوالے سے مولانا کی سیرت کو کسی اور نے قلم بند نہیں کیا۔ آل انڈیا مشاعرہ ۹ اپریل (کلیات حسرت طبع چہارم ۱۹۶۸ء صفحہ ۴۱۱ پر درج تاریخ کے مطابق ۱۰ اپریل) ۱۹۴۵ء کی رات کو امپیریل سینما میں وار فنڈ کے سلسلے میں منعقد ہوا تھا یہ وہی آنجہانی سینما ہے جو آج کل امپیریل مارکیٹ کہلاتی ہے اس مشاعرے میں مولانا نے جو غزل پڑھی تھی اس کا مطلع اور ایک شعر ملاحظہ فرمایئے:

حوصلہ ان کی شناسائی کا   سر پھرا ہے دل سودائی کا
آپ مجبور ہیں بے حوصلہ ہم   نام بدنام ہے یک جائی کا

مولانا کی دیکھ بھال صادق نسیم کے سپرد تھی اور اسی ایک دن کی ملاقات نے صادق سے ایک ایسا مضمون لکھوالیا جس کے لئے راولپنڈی کو اس کا احسان مند ہونا چاہیے حسرت اس مشاعرے کے واحد شاعر تھے جو اپنا پورا معاوضہ خاموشی سے یتیم خانہ فیض الاسلام کی نذر کر کے چل دیئے۔ رسید پر بھی اخفائے ذات کے پیش نظر اپنا نام صرف فضل الحسن لکھوایا۔ یہاں بھی صادق نے مضمون کے پردے میں ایک منجھے ہوئے خاکہ نگار کی طرح مولانا کی خاکہ نگاری کی ہے اور ان کی متانت و دیانت کو ہو بہو اسی رنگ میں پیش کیا ہے جو مولانا کا خاصہ تھا راولپنڈی میں قیام کے لئے ان کا ایک معمولی ہوٹل کا انتخاب پلنگ کے بجائے فرش پر اپنی دری بچھا دولائی اوڑھ کر سو جانا پھندنے کے بغیر میلی رومی ٹوپی رکھنے کے لئے اپنے لوٹے کو سجاذب بخشا اور مشاعرے کے معاوضے کی رسید پر رسیدی ٹکٹ چسپاں کرنے کے لئے دونی دینا ایسے واقعات ہیں جو بادی النظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے لیکن مولانا کے کردار کو جاننے والے جانتے ہیں کہ ہندوستان کی پوری ہندو سیاست کے سامنے سینہ سپر ہو جانے والا یہ مختصر سے قد کا آدمی نما ڈھانچا کس فولاد کا بنا ہوا تھا۔ مولانا نے قیام پاکستان کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے تحفظ کی خاطر ہندوستان ہی میں رہنا پسند کیا جب جونا گڑھ اور حیدر آباد دکن میں ہندوستانی فوج کا قبضہ ہو چکا تو ایک وقت ایسا بھی آیا جب ہندوستانی پارلیمنٹ میں مولانا کے سوا اور کوئی ممبر ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتا تو اس وقت مولانا نے سردار ولبھ بھائی پٹیل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم نے وہی کام کیا جو ہیسٹنگز، ولز لے اور کلائیو نے کیا تھا تم نے اپنی طاقتور فوجوں کے بل بوتے پر کمزور ریاستوں کی آزادیاں چھینی ہیں تمہارے مکھے پر خدا کی لعنت ہو۔“

یو پی اسمبلی میں بھی مولانا حسرت تنہا تھے جنہوں نے اس قرارداد کی مخالفت کی جو حیدر آباد دکن میں ہندوستانی افواج کی فتح پر مبارکباد دینے کے لئے پیش کی گئی تھی۔ صادق نسیم نے ایسے مرد جری پر ایک انوکھے زاویئے سے مضمون لکھ کر بحیثیت ادیب میرا سر فخر سے اونچا کر دیا ہے مولانا ظفر علی خاں اور مولانا عبدالمجید سالک پر لکھے گئے مضامین بھی خاکہ نگاری کے عمدہ نمونے ہیں دونوں کی شخصیت میں جو طمطراق تھا صادق نے اس سے دونوں کے کردار کا دلچسپ جائزہ لیا ہے ایک قادر الکلام شاعر شعلہ نوا خطیب اور صحافی کے طور پر سامنے آتا ہے تو دوسرا دھیمے لہجے کا بذلہ سنج و مصلحت آشنا شاعر ادیب و صحافی کے روپ میں اپنے فن کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن حیرت ہر مقام پر صادق کے حافظے گہرے مشاہدے اور باوثوق لہجے میں اظہار کی جرأت پر ہوتی ہے۔

پطرس بخاری اور سید ذوالفقار علی بخاری پر تحریر شدہ مضامین میں تو بجلیاں بھری ہوئی ہیں صادق کے

قلم کا وقار و معیار یہ ہے کہ وہ واقعات کو صحت کے مقام سے گرنے نہیں دیتا اور واقعات میں مضمر شوخی و شگفتگی کو ''غنچہ ہے اگر گل ہو، گل ہے تو گلستاں ہو'' تک پہنچانے سے باز بھی نہیں آتا اس کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ بہت سے واقعات کا عینی شاہد یا عینی شاہدوں کا براہ راست دوست ہے اس سلسلے میں سید ذوالفقار علی بخاری پر لکھے ہوئے مضمون میں زیر بحث آنیوالی سربستہ سیاسیات کے حوالے سے مثال دی جاسکتی ہے وہ بات سے بات بھی پیدا کرتا جاتا ہے اور بیچ میں علم و فضل کی گرہیں بھی کھولتا جاتا ہے یہ وصف کم وبیش اس کے ہر مضمون میں ہے اگر وہ فاضل واقعات۔ سے الگ ہو کر صرف متعلقہ شخصیات پر توجہ مرکوز کرتا تو بلاشبہ تمام مضامین کو خاکہ نگاری کا معیار عطا کر سکتا تھا۔

تاہم صادق نسیم نے پطرس بخاری کے بارے میں رشید احمد صدیقی کا یہ جملہ دہرا کر تو فی الواقع پطرس پر خاکہ نگاری کو سر بمہر کر دیا ہے ''وہ خداؤں میں صرف مسلمانوں کے خدا اور بتوں میں صرف اپنے بت کے قائل تھے'' زیر نظر مضامین میں سے سید مظہر گیلانی پر لکھے ہوئے مضمون میں بھی بجلیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں مظہر گیلانی کے کردار میں شوخی، شرارت اور شگفتی بھی ہے۔ مگر سیرت کا طنطنہ بھی برقرار ہے صادق نے اس کی کردار نگاری میں بھی ایک مشاق نثار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

وہ بتاتا ہے کہ سید مظہر گیلانی اپنے اندر بھری ہوئی بجلی دوستوں میں بھی منتقل کرتا رہتا تھا۔ جب اس نے پہلی بار ڈھائی من وزن چھ فٹ قد اور ۴۲ انچ چھاتی کے نوجوان صادق نسیم کو بطور شاعر دیکھا تو بے اختیار سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ اٹھا اور پھر اسے ایسا چلتا پھرتا سیاسی کارکن . نادیا کہ وہ پورے پشاور میں لال جھنڈے اور ترنگے کے مقابلے میں سبز ہلالی پرچم لہراتا، تقدیر کی اذاں ہے، محمد علی جناح کے نعرے لگاتا نظر آیا اس کی شخصیت مظہر کو بہت پسند آئی پشاوریوں کو مزار بنانے کا بہت شوق ہے مظہر کا بس چلتا تو وہ پشاور میں صادق نسیم کا بھی نہایت خوبصورت مزار بنواتا اور داد طلب نگاہوں سے سردار نشتر کو دیکھتا پھر یوں ہوا صادق نسیم کو شوکت واسطی بھی کچھ اپنے ڈھب کا آدمی مل گیا لہٰذا اسے بھی بہ طیب خاطر اپنے مجموعہ اضداد میں شامل کر لیا۔ اسے شوکت میں ایک خوبی تو یہ نظر آئی کہ وہ دوستوں کو غچا دینے کے فن سے آگاہ تھا کبھی انتہائی بور اور کبھی بے حد دلچسپ شخصیت کا کردار خوب ادا کر سکتا تھا لیکن اس کی دو اور خوبیوں نے بھی صادق کا من موہ لیا۔ ایک یہ کہ شوکت علی الصبح اٹھ کر جسم پر تارا میرا کے تیل کی مالش کر سکتا تھا اور احمد فراز کو بطور ''نشتر برقی'' برداشت کر سکتا تھا تاہم وہ اپنے دوستوں پر اس طرح چھایا رہتا تھا کہ صادق کو ایک بار رازداری کے لہجے میں محسن احسان کو کہنا پڑا

محسن جی خیرت گزری، شوکت، عورت نہ ہوا ور نہ محلے کی بہو بیٹیاں، اس بڑی بی کی اجازت کے بغیر اپنے میاں سے بھی بات نہ کرتیں۔"

صادق نسیم کا ایک دوست ڈاکٹر ظفر علی راجا ہے۔ وہ بھی عجیب شے ہے' ڈاکٹر حیوانات کا ہے' نسخے اراضی کی بازیابی کے لکھتا ہے اور صادق نسیم کو "ہوالشافی" کہہ کر پلاتا رہتا ہے۔ دونوں مرنجاں مرنج آدمی ہیں۔ کسی سے لڑ نہیں سکتے' اس لئے مقدمے لڑ کر گزارا کر لیتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی ڈاکٹر ظفر علی راجا کی اسناد وکالت بھی ضبط نہیں کر سکتی کہ آخر حکومت کے مالیاتی استحکام کا ایک ذریعہ وہ بھی ہے۔

صادق نسیم کہتا ہے کہ ظفر علی راجا وضع دار آدمی ہے۔ اس میں کیا کلام ہے کہ موصوف نے جب سے وکالت کا کاروبار سنبھالا ہے' صادق نسیم کو برداشت کرتا چلا آ رہا ہے۔ ویسے اس کی وضع داری کے کئی قصے مشہور ہیں۔ جن دنوں اس کا پہلا شعری مجموعہ "عریاں مکان" شائع ہوا تو وہ طباعت کے اعتبار سے بھی اتنا دلآویز تھا کہ اکرام رانا مرحوم کے ایک دوست نے رانا صاحب سے کہا کہ میرا مجموعہ کلام بھی ایسا ہی خوبصورت چھپوا دو تو بات ہے۔ اس نے کہا' یہ کون سا مشکل کام ہے۔ ظفر علی راجا کو گھر بلوا لیتے ہیں اور ویسی ہی کتاب چھپوا دیتے ہیں۔ چنانچہ رانا صاحب نے ظفر علی راجا کو فون کیا۔ وہ اپنے ہزاروں کام چھوڑ کر اگلی شام رانا صاحب کے گھر واقع آریہ نگر' ملتان روڈ لاہور چلا آیا۔ اس نے تابع فرمان شاگرد کی طرح مسودہ لیا اور کتاب کے ابتدائی مراحل خاموشی سے طے کروا دیے۔ جب کتاب چھپ گئی تو جھٹ لاہور سے اٹھا۔ راولپنڈی پہنچا اور مٹھائی لے کر امین راحت چغتائی کے گھر مبارکباد دینے چلا آیا۔

اس راجا کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیک وقت وکالت کر سکتا ہے۔ زراعت پر مضامین لکھ سکتا ہے' اخبار کے لیے روزانہ قطعہ کہہ سکتا ہے۔ چیچہ وطنی جا کر پچاس پچاس بھینسیں اور سو سو گائیں' سینکڑوں بکریاں اور مرغیاں پال سکتا ہے۔ گھر میں زخمی بلی اور صادق نسیم کی مرہم پٹی کر سکتا ہے۔۔۔ معاف فرمائیے' یہ میں نہیں کہہ رہا' صادق نسیم خود کہہ رہا ہے۔ غرضیکہ صادق نسیم اس کتاب میں پہلی بار بطور مضمون نگار ابھرا ہے۔ اس کے تمام مضامین' مربوط اور داخلی نظم و ضبط' نیز متانت و ظرافت کے دلآویز اسلوب کے حامل ہیں۔ اس کے کردار پھڑکتے ہوئے اور جملے بولتے ہوئے ہیں۔ اس کے بیان کردہ واقعات گہرے غور و فکر اور رموز علم و ادب کے مظہر ہیں۔ بیچ میں آپ بیتی کی حدت نے مرغ قبلہ نما تک کو آشیانے میں تڑپا دیا ہے۔ صادق کی عظمت یہ ہے کہ اس نے زیارت حرمین کے لیے بیوی کے ساتھ جانے سے معذرت پر ظفر علی راجا کی زبان سے یہ جملے کہلوا

کر اپنی تمام ''بے ایمانیوں'' کو از خود بے نقاب کر دیا ہے کہ ''میجر صادق صاحب ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ انہیں اس بات کا دھڑکا ہے کہ بھابھی' انہیں عین خانہ ءکعبہ کے سامنے لے جا کر پتا نہیں کون سی بات پوچھ بیٹھیں جس کے متعلق وہ حقائق چھپا نہ سکیں۔''

یہ ہے وہ صادق جو سچا ہے اور جو ہر مقام پر برصغیر کی سیاسی' علمی وتہذیبی داستان مرتب کرتا نظر آتا ہے مگر وہ طبع شگفتہ بھی ہے اور نگاہ نم دیدہ بھی۔ پس مبارک ہیں وہ لوگ جن سے ''روشنی چراغوں کی'' پھیلی ۔۔۔ اور مبارک ہے وہ ادیب جس نے کتاب میں روشنی بھر دی۔

کتاب: سر سیدؒ احمد خاں اور جدّت پسندی

مصنف: ڈاکٹر محمد علی صدیقی

ناشر: ارتقاء مطبوعات۔ گلشن اقبال۔ کراچی

ضخامت: ۲۳۰ صفحات قیمت: ۲۰۰ روپے مبصر۔ محمود اختر سعید

ڈاکٹر محمد علی صدیقی علمی وادبی حلقوں کی معروف شخصیت ہیں۔ آپ تنقید کے میدان میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ آپ نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ اُس کا تعلق ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ انحطاط سے زیادہ اور کسی نہ کسی حد تک ہر دور میں رہیگا۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے ضمیر میں یہ عنصر ہے کہ وہ تاریخ کی ہر کروٹ پر چونک اٹھتے ہیں اور اپنی روایات کو ساتھ لے کر کچھوے کی طرح اپنے خول میں سمٹ جاتے ہیں پھر رفتار زمانہ اور عصری تقاضوں کے زیر اثر مجبور ہو کر دھیرے دھیرے اس خول سے باہر نکل کر اپنی حالت زار پر ماتم کناں ہوتے ہیں کہ زمانہ بہت آگے نکل گیا۔ ہر وہ فکر وعمل جو پہلے گردن زدنی قرار دیا جا چکا تھا ان علوم کا ایک ایک پرت کھولتے ہیں اور مسلمانوں کے لئے ان علوم کا حصول فرض عین قرار دیتے جاتے ہیں۔

سر سید احمد خان مسلمانوں میں راجہ رام موہن رائے کی طرح برہمو ناج جیسے فرقہ کے بانی نہیں تھے راجہ رام موہن رائے برہمو سماج کے قیام کے بعد بھی ہندو رہے اور سید احمد خاں علوم جدیدہ کی حمایت کی پاداش میں نیچری اور ملحد ٹھہرائے گئے سید احمد خاں کی طرح ہی ترکی میں نامق کمال اور مصر میں مفتی عبدہ، نے یہی کردار ادا کیا۔ اور ان نظریات کی پر زور حمایت کی کہ اسلام اور جدیدیت ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ایک دوسرے کو طاقتور بناتے ہیں علامہ امیر شکیب ارسلان نے بھی اپنی تصنیف ''اسباب زوال امت'' میں

ایسے غلط افکار ونظریات کی طرف اشارہ کیا ہے جنھوں نے مسلمانوں کو دنیا سے الگ کر کے اسلام کو محض آخرت کا دین بنا دیا ہے سرسید احمد خاں کا نظریہ بھی یہی ہے کہ ان قدامت پسندوں نے سائنس، کیمیا اور فلسفہ جدید کی مخالفت محض اس لئے کی کہ یہ کافروں کے علوم ہیں مسلمانوں کو ان علوم سے محروم کر کے ان کو پس ماندگی کے اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا گیا آخر کار سید احمد خاں کی پر خلوص جدوجہد رنگ لائی سید احمد خاں کے شدید مخالف اکبر الہ آبادی اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی سید احمد خاں کو عالم اسلام کا سب سے بڑا انقلابی مفکر ماننے پر مجبور ہوئے۔ زیرِ نظر کتاب میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے سرسید کی مذہبی فکر، سیاست، تصورِ علم کے ساتھ ساتھ جدیدیت اور روایت جیسے اہم مسائل پر مسلم مفادات کی روشنی میں نہایت پر مغز تجزیہ کیا ہے امید ہے ڈاکٹر صاحب کی یہ گرانقدر کاوش اہل علم کو فکر ونظر کے نئے زاویئے عطا کرے گی۔

کتاب : شاعر المانوی گوئٹے کا ''دیوان شرق وغرب''

مترجم : میاں غلام قادر

ناشر : نیشنل بک فاؤنڈیشن۔ اسلام آباد

ضخامت : ۱۹۰ صفحات قیمت: ۱۰۰ روپئے مبصر۔ محمود اختر سعید

گوئٹے (۱۷۴۹۔۱۸۳۲ء) جس کا پورا نام یوحان ولف گانگ فان گوئٹے تھا جرمنی کا ایک شہرہ آفاق شاعر تھا۔ اگرچہ قدرت نے اسے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا وہ بیک وقت سائنس دان، مفکر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ڈرامہ نگار بھی تھا۔ لیکن بحیثیت ایک فلسفی شاعر گوئٹے کا نام تمام دنیا میں مشہور ہے چونکہ یہ فلسفی شاعر مشرق کی ادبی شخصیات، خصوصاً دین اسلام، نبی اکرمؐ اور قرآن مجید سے متاثر تھا اس وجہ سے اہل مغرب نے اسے ہمیشہ تعصب کی نگاہ سے دیکھا برصغیر میں گوئٹے کو متعارف کرانے والی عظیم شخصیت علامہ اقبالؒ کی تھی۔ جاوید اقبال زیرِ نظر کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں'' ــــــ گوئٹے کو برصغیر میں متعارف کرانے والی شخصیت دراصل علامہ اقبالؒ تھے۔ جو طالب علمی کے زمانے میں ہائیڈل برگ میں اپنے قیام کے دوران اس کی شخصیت اور کلام سے بے حد متاثر ہوئے۔ــــ'' علامہ اقبالؒ نے جو جرمن زبان کے سکالر بھی تھے گوئٹے کے افکار و فلسفہ کا بنظرِ غور مطالعہ کیا، وطن واپس آکر گوئٹے کے ''دیوان شرق وغرب'' کے جواب میں سو سال بعد 'پیامِ مشرق' تحریر کی۔ اردو ادب کے شائقین کی خوش قسمتی کہئے کہ ایک عرصہ بعد گوئٹے کے اس دیوان

کو میاں غلام قادر نے اردو میں نہایت سلیس اور رواں ترجمہ کیا ہے اس ترجمہ کی خوبیوں کے بارے میں امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد لکھتے ہیں"۔۔۔میاں غلام قادر نے شاعر المانوی کے"دیوان شرق وغرب" کا اردوئے معلیٰ میں ترجمہ کر کے اردو ادب میں ایک کلاسک کا اضافہ کیا ہے۔حافظ شیراز کے ساتھ ان (گوئٹے) کا عشق اور اس سے بھی بڑھ کر حضور نبی کریمؐ کے ساتھ ان کا تعلق خاطر کا پتہ غلام قادر صاحب کے دیوان شرق وغرب کے ترجمے سے ہوا ہے۔۔۔میاں صاحب نے نثر میں ادبی حسن پیدا کر کے اسے جاندار شعر کا ہم پلہ بنا دیا ہے۔اسے پڑھ کر اقبال کی اعلیٰ پائے کی شاعری کی طرح کا لطف حاصل ہوتا ہے اور دل میں حرارت اور جسم میں گزار پیدا ہوتا ہے بار ہا آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں" دیدہ زیب گیٹ اپ کے ساتھ شائع ہونے والی یہ ادبی کاوش اہل علم وادب میں بنظر تحسین دیکھی جائے گی یقیناً یہ ہمارے ادبی خزانہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

کتاب : دنیائے نعت (نعت نمبر)

مرتب ومؤلف: عزیز الدین خاکی

ناشر : تنظیم استحکام نعت (ٹرسٹ) کراچی

ضخامت : ۲۴۰ صفحات ہدیہ : ۵۰ روپے مبصر۔محمود اختر سعید

تنظیم استحکام نعت (ٹرسٹ) کراچی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس ادارہ نے فروغ حمد ونعت کے سلسلہ میں بیش بہا کام سرانجام دیا ہے زیر نظر شمارہ (نعت نمبر) سے قبل سلسلہ نمبر دو، جو سید رفقی عزیزی نمبر تھا، اس پر'الاقرباء' میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے یہ ادارہ حمدِ باری تعالیٰ اور مدحتِ سرکار مدینہ کے سلسلہ میں پاکستان اور بیرون ملک جہاں جہاں بھی ایمان افروز محافل منعقد ہوتی ہیں ان تمام محافل کی خبریں دینے اور نعت گو شعراء کو متعارف کرانے میں بھی کلیدی کردار ادا کر رہا ہے شائع شدہ مجموعہ ہائے حمد ونعت پر مختصر تعارف نامے بھی قارئین تک پہنچائے جاتے ہیں۔

یوں دنیائے نعت محض ایک نام نہیں بلکہ ایک تحریک ہے زیر نظر نعت نمبر میں حمد ونعت پر بہت ہی پُر مغز اور وقیع مضامین ہیں، جن میں تین چار قابلِ ذکر ہیں۔ا) نعت نگاری اور عہد حاضر کے تقاضے۔از پروفیسر منظر ایوبی۔۲) مناجات کی اہمیت اور افادیت۔از طاہر سلطانی۔۳) بلوچستان میں اردو نعت گوئی۔از

ڈاکٹر سلطان الطاف علی۔۴) نعت اور اس کا تقدس۔از قمر وارثی۔علاوہ ازیں۔۵) اردو میں نعتیہ شاعری، از پروفیسر ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق کے اس مقالے کا خلاصہ جس پر انہیں ناگپور (بھارت) کی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی اس مقالہ کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اردو میں نعتیہ شاعری پر پہلا تحقیقی و علمی مقالہ ہے۔ بہر حال دنیائے نعت سے متعلق تمام حضرات اس عظیم کاوش پر لائق صد تحسین ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کی مساعی جمیلہ کو شرف قبولیت بخشے اور اجر عظیم عطا کرے۔ اس نعت نمبر کا سرورق مسجد نبوی کا مینارۂ نور اور گنبد خضرا کی ایمان افروز تصویر سے مزین ہے۔

کتاب : سوشلزم اور عصری تقاضے

مصنف : ڈاکٹر خیال امروہوی

ناشر : کلاسیک۔لاہور

ضخامت : ۲۸۸صفحات قیمت: ۱۵۰روپے مبصر۔محمود اختر سعید

ڈاکٹر خیال امروہوی علمی و ادبی حلقوں کا ایک معروف نام ہے۔ چند آپ نظم و نثر لکھنے پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ تاہم بحیثیت سخنور شہرت کا ایک مقام رکھتے ہیں۔ آپ کئی شعری مجموعوں اور نثری کتابو ں کے خالق ہیں۔ زیر نظر کتاب 'سوشلزم اور عصری تقاضے' بھی انہی طبع شدہ کتابوں میں سے ایک ہے، جو آپ نے نہایت دیانتداری سے۔ تیسری دنیا کے ترقی پذیر قوموں کی فلاح و خوشحالی کے لئے پیش کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ترقی پذیر ممالک خصوصاً پاکستان کی سیاسی، معاشی اور سماجی بقا کا واحد راستہ سوشلزم، میں پنہاں ہے۔ سوشلزم سے الرجک مکتبہ فکر کے سلسلہ میں مشہور اشتراکی شاعر ظہیر کاشمیری کہتے ہیں"۔۔ ڈاکٹر صاحب کی کتاب کئی حوالوں سے موجودہ دور کے بہت سے اہم معاشی' معاشرتی' سیاسی' قانونی اور اخلاقی سوالوں کا جواب فراہم کرتی ہے۔۔"ایک دور تھا جب ادب میں بھی سوشلزم کا کافی چرچا رہا۔ یہ حلقہ ترقی پسند تحریک، سے متعلق تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پرامن، خوشحال بین الاقوامی معاشرہ تشکیل دینے کے لئے انقلابی فکر و عمل کی ضرورت ہے 'سوشلزم امن اور خوشحالی کی ضمانت ہے' ذہنی اور بدنی غلامی سے نجات کا ذریعہ ہے۔ بقول معروف ترقی پسند ادیب و نقاد مشتاق احمد"۔۔۔خیال امروہوی نے ایسے افکار و خیالات اور تصورات و نظریات کو موضوع بحث بنایا ہے' جن کا تعلق سوشلزم کے ان پہلوؤں سے ہے' جو عصر حاضر کے

بورژوا دانشوروں کی تنقید کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔۔۔۔" الغرض سوشلسٹ حلقہ فکر کا محور اور جدوجہد صرف اور صرف یہ تھی کہ سماج کو بدلنے کے لئے انقلابی افکار و خیالات کی ترویج و اشاعت ایک نظریاتی فریضہ ہے۔ یہ وہ افکار و تصورات ہیں جن کو اس کتاب میں موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ بہر حال یہ کتاب سوشلسٹ لٹریچر میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ مصنف کی پر خلوص اور نیک نیتی پر مبنی یہ کاوش قابلِ تعریف ہے۔

کتاب : میں تنہا چل نہیں سکتا

مصنف : ولی محمد عظمی

ناشر : خزینہ علم و ادب لاہور

ضخامت : ۱۲۷ صفحات قیمت: ۱۳۰ روپے مبصر۔ محمود اختر سعید

زیر نظر کتاب ولی محمد عظمی کا شعری مجموعہ ہے۔ موصوف کا تعلق ضلع قصور کے ایک غیر معروف قصبہ سے ہے۔ آپ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ آپ نے عشق و محبت، ہجر و وصال، پردیسیوں کے دکھ، اپنوں کی بے حسی، دولت کی ہوس، اور غیروں کی ستم ظریفیوں جیسے روایتی مضامین کو بطور خاص موضوع سخن بنایا ہے۔ اس مجموعہ میں ایک حمد اور ایک نعت کے بعد تقریباً ستر عدد غزلیں اور تین نظمیں ہیں انداز تحریر روایتی رنگ لئے ہوئے ہے کہیں کہیں نئے کھلتے ہوئے شگوفوں کی تازگی بھی محسوس ہوتی ہے آپ کا تعلق اگرچہ کسی معروف ادبی مرکز سے دور ہے تاہم اچھا لکھنا اور فکر و نظر کی گہرائی و گیرائی کا تعلق کسی مخصوص علاقہ سے نہیں ہے شعر کہنے کے لئے جن بنیادی عوامل کا ہونا ضروری ہے وہ سب میسر ہوں اور پھر لفظ و بیان کے رکھ رکھاؤ کی آگاہی ہو ایسے اہل قلم اپنے گردوپیش سے نوع بنوع مضامین چنتے ہیں اور انہیں دلنشیں لب و لہجہ عطا کر کے اپنی ہر دلعزیزی کی مہر لگا دیتے ہیں شاعر موصوف کے بارے میں انہی کے ایک کرم فرما اعجاز احمد عابد اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "۔۔۔ ولی محمد عظمی میں یہ تمام صفات موجود ہیں انہوں نے روایت اور جدت دونوں کو اپنی غزلوں میں سمویا ہے۔" کیونکہ آپ کا یہ پہلا شعری مجموعہ ہے لہٰذا آپ کے رنگ سخن اور فنی مقام کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا قبل از وقت ہوگا، تاہم ان کا جو کلام ہمارے سامنے ہے اس کی تازگی اور شگفتگی کو دیکھ کر امید ہے کہ آپ مستقبل کے شعری ادب میں بہتر مقام پائینگے۔ آپ کا زیر نظر مجموعہ اردو شاعری میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

کتاب : مدینہ میری منزل ہے

شاعر : میاں واحد ظہیر واحد لدھیانوی

ناشر : کتاب نگر۔۲۴ حسن آرکیڈ۔ملتان کینٹ

ضخامت : ۹۶ صفحات قیمت:۷۵ روپے مبصر۔محمود اختر سعید

زیرِ نظر نعتیہ مجموعہ بزرگ شاعر میاں واحد ظہیر واحد لدھیانوی کے پاکیزہ خیالات وتصورات کی عکاسی ہے کئی سال پیشتر آپ کا ایک نعتیہ مجموعہ 'شہرِ تمنا' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ پیش نظر نعتیہ مجموعہ "مدینہ میری منزل ہے" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ بھی اسی سلسلہء ذوق وشوق اور ہوائے مدینہ کی کڑی ہے۔ آپ ہر دم اذنِ حضوری کے تمنائی اور طلب گار تھے۔

مدینہ ان کے نزدیک محض ایک شہر نہیں بلکہ شہرِ تمنا ہے اسلئے کہ وہ آستانہ رحمت دو عالمؐ ہے آپ کو دیارِ نبیؐ کی ہر گلی مثلِ طور اور نور سے معمور دکھائی دیتی تھی۔ ہوائے شہرِ بطحا ان کو سرمست و بے خود کیئے دے رہی تھی۔ اس شہرِ نور کا ہر ذرہ برق طور ہے۔ ڈاکٹر عاصی کرنالی آپ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "حاضری اور حضوری کا مضمون واحد ظہیر کے نعتیہ اشعار کی بنیاد ہے۔ یا یوں کہیئے کہ ان کا اساسی اور کلیدی موضوع۔ ہے ان کی نعتوں میں رنگا رنگ مضامین کی بہار آفرینی ہے واحد ظہیر شاعری میں تکلف یا کوئی آرائش لفظی کی صنعتکاری نہیں برتتے' وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ سادگی میں جذبہ کی سچائی، اور اظہار وابلاغ کی سلیقہ مندی شامل ہوتی ہے ان کی شاعری کی تاثیر اتنی گہری ہے کہ ہم بھی ایسے شعروں کو بہ چشم نم پڑھتے ہیں۔۔۔"

موصوف کا تعلق لدھیانہ کے ایک ایسے علمی گھرانہ سے تھا، جس میں م حسن لطیفی جیسے نابغہ روزگار شاعر، ادیب اور صحافی نے جنم لیا۔ لطیفی مرحوم کی آراستہ علمی وادبی کہکشاں میں ساحر لدھیانوی، حافظ لدھیانوی، ظہور نظر اور حافظ انصر جیسے آفتاب ومہتاب ہمہ وقت رونق افروز رہتے تھے بقول ڈاکٹر عاصی کرنالی، واحد ظہیر اس علمی ماحول میں اور ایسے ہی دامان فضیلت کے سائے میں پل بڑھ کر جوان ہوئے۔ جو شخص ایسی علمی فضا میں سانس لیتا ہوا اس کو خود شعر وادب کی تخلیق کا ذوق کیوں نہ ہوگا۔" ہمیں امید ہے کہ 'شہرِ تمنا' کی طرح آپ کا یہ نعتیہ مجموعہ بھی اردو ادب کے شعری ذخیرہ میں اہم اضافہ تصور کیا جائے گا اور اہل ذوق نیز عاشقان سرکار مدینہ میں شرف قبولیت پائے گا۔

مراسلات ☆

مشکور حسین یاد۔ لاہور

الاقرباء کے تازہ شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۴ء کے اداریہ میں آپ نے پھر کشمکش سے لبریز اہل صحافت اور اہل ادب کے درمیان کا ایک مسئلہ چھیڑا ہے اہل سیاست اہل صحافت سے آج کے دور ہی میں نہیں ڈرتے نپولین نے ایک دفعہ کہا تھا کہ میں دنیا بھر کی فوج کا مقابلہ کرسکتا ہوں اخبار کے ایک ایڈیٹر کا مقابلہ نہیں کرسکتا اہل صحافت کا تعلق جیسا کہ آپ نے بھی لکھا ہے روزمرہ کے مسائل سے ہوتا ہے اور اہل سیاست کا بھی یہی حال ہے۔ ادھر عوام بھی روزمرہ کے مسائل ہی میں الجھے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے اہل اقتدار و سیاست کیلئے جس قدر دردسر اور پریشانی کا باعث اہل صحافت بن سکتے ہیں اور بنتے رہتے ہیں اہل ادب نہیں بنتے کیونکہ اہل ادب روزمرہ کے مسائل سے اس طرح دست و گریباں نہیں ہوتے جس طرح ایک صحافی ہوتا ہے ایک ادیب کے سامنے تو پوری زندگی ہوتی ہے اپنے ماضی حال سے لے کر مستقبل تک لہٰذا روزمرہ کے مسائل میں الجھے ہوئے عوام یا خواص کی پوری زندگی کے بارے میں سوچنے کے لئے کہاں فرصت ہوتی ہے اور اس طرح ایک ادیب سے زیادہ نیوسنس ویلیو صحافی کی ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے ایک صحافی کی چودھراہٹ بھی زیادہ قائم ہوتی ہے آج کے دور میں چونکہ ہمارے ادیب بھی بزعم خویش بہت حقیقت پسند بننے

غزل ☆☆

اپنا ہنر تھا آنا فانا
سارا سفر تھا آنا فانا
روبرو تھی وہ سمت آبرو
ادھر ادھر تھا آنا فانا
دن نکلا اور ڈھل بھی گیا
خون جگر تھا آنا فانا
خلد خیر خرام میں ہم ہیں
حشر کا شر تھا آنا فانا
آنکھ کھلی تو سامنے صبح تھی
قرض قمر تھا آنا فانا
صحرا کیونکر پیاس بجھاتے
دیدہ تر تھا آنا فانا
یاد ہمیں تے دیر لگائی
معرکہ سر تھا آنا فانا

☆ فاضل مراسلہ نگار حضرات کی آراء کو ادارہ کا نقطہ نظر نہ سمجھا جائے (مدیر)

☆☆ یاد صاحب نے دو غزلیں مرحمت فرمائیں۔ زیر نظر غزل غالباً تفنن طبع کیلئے ہے اس لئے مراسلے کے ساتھ نذر قارئین ہے۔ (ادارہ)

کی مصیبت میں مبتلا ہیں اس طرح وہ اپنا رعب قائم رکھنے کے لئے کالم نگار بننا بھی ضروری سمجھتے ہیں جس زمانہ میں مرحومہ پروین شاکر، کشور ناہید، امجد اسلام امجد وغیرہم نے اخبار میں کالم لکھنے شروع کئے مجھے یوں لگا جیسے یہ لوگ بھی برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہو گئے ہیں اور محض اپنی چودھراہٹ اور نیوسنس ویلیو بنانے کی تمنا میں مرے جا رہے ہیں جب میں نے اس کا ذکر پروین شاکر سے کیا تو کہنے لگیں آپ بات ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں ہمارے ادیبوں میں ایک محترم جمیل الدین عالی ہیں جو کافی عرصے سے کالم لکھ رہے ہیں اور بقول شخصے کیا بقول اشخاص ان کا کالم سب سے زیادہ بور ہوتا ہے اسی لئے بہت کم پڑھا جاتا ہے لیکن یہ خوش ہیں کہ ان کی بھی ایک نیوسنس ویلیو ہے ایک ادیب کے لئے سب سے بور کام کالم لکھنا ہوتا ہے اشفاق احمد خاں صاحب بھی میری اس بات کو مانتے ہیں جب روزنامہ جنگ لاہور سے نکلنے والا تھا تو عزیزم شکیل الرحمٰن حسن رضوی کے ہمراہ میرے گھر کئی بار تشریف لائے کہ میں کالم لکھوں میں نے بادل ناخواستہ ان کی بات مان لی اور مشکل سے تین ماہ کالم لکھا اور اس کار دشوار سے باز آ گیا۔

لہٰذا قبلہ منصور عاقل صاحب جب تک لوگ روزمرہ کے مسائل میں الجھے رہیں گے اور جب تک اہل سیاست عوام کو چھوڑ کر خود غرضی کا شکار رہیں گے ایک صحافی کی ٹور ایک ادیب کے مقابلے میں زیادہ رہے گی۔ البتہ جب ایسا زمانہ آئے گا کہ انسان حال سے خواہ قدرے ہی سہی مطمئن ہوگا اور اس کی نگاہ اپنے مستقبل پر بھی جائے گی تو اہل ادب کی عزت وحُرمت میں بھی اضافہ ہو جائے گا یوں اہل ادب کی آج بھی لوگوں کے دلوں میں قدر ومنزلت ہے مگر یہ قدر ومنزلت دلوں سے باہر نکل کر ان کی جیبوں تک نہیں کھنکھنائی انشاء اللہ امید رکھئے ایسا بھی ہو جائے گا ورنہ آج بھی ایسے ادیب موجود ہیں جو موقع شناسی سے کام لیتے ہوئے اپنی جیب بھی گرم رکھتے ہیں اب یہ ایک بالکل الگ مسئلہ ہے کہ میرا آپ کا کلچر ہمیں دنیاداری کی طرف پوری طرح مائل نہیں ہونے دیتا۔

آپ نے جو میری ایک مطبوعہ غزل کے اس شعر کے پہلے مصرع کے بارے میں بات کی ہے اس کے بارے میں بعد میں عرض کروں گا پہلے وہ شعر لکھ رہا ہوں۔

ہم یہ سمجھتے ہیں جیسے ہم اپنے ہاتھ سے نکل گئے   جونہی ڈھلک کر ترساں لرزاں آنسو میں آتا ہے وقت

ہاں تو جناب آپ نے فرمایا ہے اس شعر کے پہلے مصرع پر میں غور کروں۔ حضور! اس پوری غزل کی بحر ایسی ہے کہ اس کے تمام اشعار کے حروف علت کی قرات کے وقت حسب موقع حروف کو کہیں دبانا اور

کہیں واضح کرنا پڑتا ہے اگر آپ ایسا نہیں کرتے پھر تو یہ ایک شعر کیا سارے شعر ہی وزن کے اعتبار سے قابل غور کہے جاسکتے ہیں اور اگر احتیاط سے اس کی قرأت ہو تو سب اشعار وزن میں ہیں اور اس شعر کا مصرع اول بھی ٹھیک ٹھاک ہے ہاتھ سے کے لفظ سے کی یائے مجہول ہے اسے دبنے دیجیئے پھر سب ٹھیک ہے۔

ڈاکٹر خیال امروہوی۔لیہ

تازہ سہ ماہی الاقرباء حسب روایت نہایت مفید و موثر مقالات سے معمور ہے الاقرباء کے لئے فائلوں میں مقالہ تلاش کرر ہا ہوں تاکہ کمپوز کروا کر برائے اشاعت ارسال کردوں۔رباعیات اگر یہ رباعی کے اوزان پر پوری اتریں تو قبول فرما کر شامل الاقرباء کرلیں۔رباعی کے تقریباً بیں اوزان ہیں تمام اوزان پر تو شاید ہی کسی نے کامیابی حاصل کی ہو اقبال اور جوش بھی راستے میں ہی رہ گئے۔دراصل قدیم فارسی شعری اسالیب میں اس صنف کو چہار مصرعی کہا جاتا تھا۔عمر خیام سے جتنی بھی رباعیاں منسوب ہیں وہ بھی زیادہ اوزان میں نہیں ہیں رباعی میں موضوع کے ساتھ ساتھ فصاحت، تغزل پیدا کرنا بڑی مصیبت کا کام ہے۔

جوشعراء رباعی میں قافیہ اور ردیف استعمال نہیں کرتے بلکہ قافیہ اور ردیف یکساں ہوتے ہیں ایسی رباعیاں بے لطف ہو جاتی ہیں قطعہ اور رباعی میں فرق کرنا بھی ضروری ہوتا ہے کیونکہ قطعہ تو ۱۹ بحروں میں سے کسی بحر میں کہا جاسکتا ہے لیکن رباعی میں ایسی کوئی سہولت یا رعایت نہیں ہوتی رباعی کا عام وزن ہے۔

لاحول ولاقوۃ الا باللہ

یا........ من ندانم فاعلاتن فاعلات   شعرمی گویم بہ از قند و نبات

بیا تا کار ایں امت بسازیم (اقبال)   آمد سحر نداز میخانہ ءما (خیام)

اس صنف میں راقم نے بھی کوشش کی تھی حسب ارشاد خزف ریزے ارسال ہیں۔

مضطر اکبر آبادی۔راولپنڈی

جنوری، فروری، مارچ کا ''الاقرباء'' ملا شکریہ اس سے پہلے گزشتہ سال اقبال نمبر ملا تھا۔درمیان میں کوئی شمارہ موصول نہیں ہوا غالباً اسکی وجہ یہ ہو کہ آپ کے دفتر میں میرے مکان کا نمبر این اے ۱۹۸ کی جگہ این اے ۸۹ ادرج ہے براہ کرم مکان نمبر درست کرادیجیے۔

یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ ''الاقرباء'' کے سلسلہ میں آپ کا نقطہ نظر تجارتی قطعی نہیں بلکہ ادب کی

خدمت اور فروغ ہے آج کے بے راہ روی کے دور میں یہ بڑی بات ہے لفظ کیفیت کے سلسلہ میں تابش دہلوی صاحب کا اعتراض قطعی درست ہے کیونکہ کیفیت، علیت، طبعیت، حیثیت، اذیت، اقلیت، اکثریت اور اس قبیل کے تمام عربی الفاظ میں ''ی'' مشدّد ہے۔ ''طرح'' کو ''طرحا'' کے وزن پر نظم کرنا درست نہیں اس کے علاوہ ''قدر'' اور ''قدَر'' دونوں طرح ہیں اول التحریر یعنی ''د'' پر جزم کے ساتھ عزت، بزرگی، مرتبہ، مقدار اور یکساں کے معنوں میں آتا ہے جبکہ قدر یعنی ''د'' پر زبر کے ساتھ تقدیر الٰہی فرمان اور حکم کے معنی دیتا ہے۔

سیدہ نغمہ زیدی۔ پشاور

حسب سابق ''الاقرباء'' کا تازہ شمارہ نہایت دلفریب رنگوں سے سجا آیا۔ اداریہ جاذب توجہ بنا۔ پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی صاحب نے جس تلخ حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے وہ اگرچہ ارباب اقتدار کے لئے قابل قبول نہ بھی ہو۔ اُس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب تک اہل علم ودانش کے ساتھ بلاتفریق رنگ و نسل وعلاقہ مساوی برتاؤ نہ کیا جائے گا۔ ان کا احساس محرومی فزوں تر ہی ہوتا جائے گا۔ خدا کرے کہ انصاف پر مبنی معاشرے کا خواب پورا ہو سکے۔ کیونکہ قرطاس وقلم کی حقیقی قدر افزائی ملکی مستقبل کی بہتری اور بقا کی ضامن ہے۔ کم وبیش تمام مضامین قلب ونظر کو طراوت بخشنے والے تھے۔ خاص طور پر ''محمد شفیع عارف دہلوی'' کے مضمون ''سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء'' پڑھ کر روحانی بالیدگی حاصل ہوئی۔ شاکر کنڈان صاحب کا ''سرمد مجذوب فلسفی'' گراں قدر معلومات پر مبنی تھا۔ اس کے علاوہ ''رموز ونکات سخن'' جیسے مضامین ادبی نو واردوں کے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی جیسے قادر الکلام شاعر خال خال ہی ہوتے ہیں۔ ان کی فی البدیہہ شاعری دل میں اترتی چلی گئی۔ ڈاکٹر عاصی کرنالی کا انشائیہ حسب سابق فکر انگیز تھا۔ غرض تمام مضامین گویا آسمان ادب پر جگمگاتے ستارے ہیں۔ جن کی ضو بڑھتی جا رہی ہے۔

حصہ نظم بھی خوبصورت غزلوں پر مشتمل تھا۔ تقریباً تمام شعراء کا کلام تازگی وجدّت لئے ہوئے تھا۔ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو روز افزوں ترقی عطا فرمائے۔

عبدالعزیز خالد۔ لاہور

جناب سرور انبالوی نے ''کیفیت'' اور ''تربیت'' کے غیر مشدد ہونے کے بارے میں علامہ اقبال کے دو شعروں کا جو حوالہ دیا آپ نے اسے ان کے سہو پر محمول کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''متعلقہ الفاظ کو مشدد پڑھیں گے تو درست پائیں گے۔'' (صفحہ ۱۴۳)

دونوں شعروں کی تقطیع حسب ذیل ہوگی:

کیفیت: کیفیت باقی پرانے کوہ وصحرا میں نہیں ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر

کیفیت با	قی پرانے	کوہ وصحرا	میں نہیں
ہے جنوں تے	رانیا پے	دانیاوی	رانہ کر
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلن

بحر رمل مثمن محذوف

تربیت: نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے

ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سرو کنارِ جو کا

نہ ہو طبیعت	ہی جن کی قابل	وہ تربیت سے	نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسب	زرہ کے پانی	میں عکس سرو	کنارِ جو کا
فعول فعلن	فعول فعلن	فعول فعلن	فعول فعلن

۔۔۔بحر متقارب مقبوض اثلم

'کیفیت' کے غیر مشدد ہونے کی اور مثالیں:

اقبال: سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی

داغ: کیفیت خاص ہے گویا مری مجبوری کی حال جو یار کا ہنگامِ قسم ہوتا ہے

سنجری: مے کو زدستِ ساقیِ مشکیں کلالہ نیست در صد سبوش کیفیت یک پیالہ نیست

مشدد کی مثالیں:

اقبال: دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقریر سے کسوتِ مینا میں مے مستور بھی عریاں بھی ہے

کہنے لگا کہ دیکھ تو کیفیت خزاں اوراق ہو گئے شجر زندگی کے زرد

سودا: کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا

آتش: بوئے مے رکھتی ہے اس میکدے میں کیفیت محتسب توڑ کے شیشے کو پشیماں ہوگا

انیس: نجف میں شراب آ کے سرکہ بنی وہ کیفیت نشہ کیا ہو گئی

ذوق: لیک بے یاوریِ بخت نہیں کیفیت

امیر: وحشت میں امیر اپنے برابر نہ ہوا قیس — شاگرد میں کیفیت استاد نہ آئی

داغ: جب ہے کیفیت رہوں یوں اس کے ساتھ — نشہ و مے جس طرح توأم رہیں

مطلب یہ کہ یہ لفظ مشدّ د اور غیر مشدّ د۔۔۔کیفیّت' کیفیت۔۔۔دونوں طرح سے صحیح ہے۔

تربیت: غیر مشدّ د کی اور مثالیں:

اقبال: ہوئی ہے تربیت آغوش بیت اللہ میں تیری — دلِ شوریدہ ہے لیکن صنم خانے کا شیدائی

" تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں — جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں

" مرے حلقۂ سخن میں ابھی زیر تربیت ہیں — وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ رسم شاہ بازی

" خودی کی تربیت و پرورش پہ ہے موقوف — کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتش پُرسوز

اکبر: مگر قومی اطبا دور ہی کر دیں گے یہ نزلہ — قوی اطفال کو کردے گی آخر تربیت ان کی

سعدی: تربیت نا اہل راچوں گردگاں بر گنبد است

گردگاں: اخروٹ

گردگاں بر گنبد۔۔۔Fickle, unsteady, unstable

Steingass

علیت:	علیت	:	استینگاس
غیر مشدد:	"	:	پلیٹس
	"	:	شیکسپیئر
	"	:	فرہنگ عامرہ

مشدد: ہوتی جس شخص میں ہے علمیّت — ہر جگہ اس کی ہوتی ہے عزت

۔۔۔ادب

ذوق: ذہن میں سب مرے حاضر صور علمیہ — پر جتانی مجھے منظور نہ تھی علمیّت

علیت	--------	فرہنگ کارواں
"	--------	علمی اردو لغت
"	--------	قائد اللغات
"	--------	فرہنگ آصفیہ

" ------۔-   یہ مصدر اردو میں علم سے بنالیا ہے۔اردو میں بغیر تشدید فصیح ہے(نوراللغات)

" علمیت میں ی مشدد اور غیر مشدد دونوں مستعمل ہیں (نسیم اللغات)

مطلب یہ کہ علیت اور علمیت دونوں درست ہیں۔

مراسلہ نگار کے اپنے اصلاحی مصرعے: ریت کی طرح یہ مٹھی میں بھی رکتا ہی نہیں

پر آپ نے لکھا ہے: اصلاح لفظ "طرح" کے حوالے سے محلِ نظر ہے۔لفظ "طرح" کا تلفظ بھی بوزن "صبح" کیا جاتا ہے نہ کہ طرحا یا صبحا۔مصرعے کی تقطیع یہ ہے:

ریت کی طر	ح یہ مٹھی	میں بھی رکتا	ہی نہیں
فاعلاتن	فعلاتن	فعلاتن	فعِلن

-----بحر رمل مثمن مجنون محذوف •

مصرعے میں 'طرح' بوزنِ "صبح" ہی بندھا ہے۔

صفحہ ۳۰ پر حافظ کے اس شعر:

وقت راغنیمت داں آں قدر کہ بتوانی   حاصل از حیات اے جاں یکدم است نادانی

پر آپ نے یہ حاشیہ دیا ہے: اس شعر میں قدر متحرک استعمال ہوا ہے جیسا کہ قضاوقدر جبکہ باعتبار معنی ساکن ہونا چاہئے۔(قدر بمعنی مقدار)

قدر: مقدار، مقیاس انداز کے معنوں میں متحرک ہے: قدر: چہ قدر، ایں قدر

قرآن: انا کل شی خلقناہ بقدر (۴۹:۵۴) ہم نے ہر چیز اندازۂ مقرر کے ساتھ پیدا کی۔

" وما نزلہ الا بقدر معلوم (۲۱:۱۵) اور ہم اس کو بہ مقدارِ مناسب میں اتارتے ہیں

انہی معنوں میں قرآن نے قدر کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔

" قد جعل اللہ وبکل شی قدرا (۳:۶۵) خدا نے ہر چیز کا اندازہ کر رکھا ہے۔

غالب: اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

" گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر

" قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

۔۔۔شمارِ شوق ندانستہ ام کہ تا چنداست جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومنداست

اقبال: ایں قدر یست کہ چشم نگرانے دارد

قدر: عزت، توقیر، منزلت کے معنوں میں قدر ہے۔ قدر و قیمت

اقبال: قدر آرام کی اگر سمجھو

" قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یکدانہ کی

" اٹھ گئے آہ قدرداں اپنے

آتش: آتش سخن کی قدر زمانے سے اٹھ گئی

" خاتمِ دست سلیماں قدر کیا رکھتی ہے یاں

ناسخ: ذرا دیکھے کوئی ابرو تو سمجھے قدر شاعر کی

نصیر: قدر اس کی چشمِ اہل نظر میں زیادہ ہے جو آپ کو نصیر سمجھتا ہے سب سے کم

قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری قدرِ نعمت ہوتی ہے بعدِ زوال

قدر: تقدیر: والقدر خيره وشره من الله تعالىٰ

ليلة القدر .. اهل القدر .... قدريه (معتزله) .. جبروقدر

قدر: قدر جمع اقدار۔۔۔سکون و حرکت دونوں درست (لسان العرب۔ الفرائد الدریہ، منجد)

قضاوقدر: قضاوقدر (اسٹینگاس)

القدر والقدر: (ابن سیدہ۔ لسان العرب۔ منجد)

ہم ان پہ مر کے زندۂ جاوید ہو نہ جائیں ٹھہرے کہیں نہ حکمِ قضاوقدر دروغ (حسرت)

قضاوقدر کا سرِ نہاں ہے کس پہ عیاں

قرآن: ومتعوهن على الوسع قدره وعلى المقتر قدره (۲۳۶:۲)

اور ان کو خرچ دو۔ وسعت والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق

قال الفراء : قرئ قدره و قدره (لسان العرب)

وكانَ امر الله قَدَراً مَقْدورا

ابوالحسن نے کہا: قَدَر اور قدر (دال کی فتح اور سکون کے ساتھ) دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ (مفردات القرآن)

خلاصہ کلام یہ کہ اس سیاق میں قدر اور قدر دونوں صحیح ہیں ۔۔۔ (قضا و قدَر بھی اور قضا و قدْر بھی) ☆

سید مرتضیٰ موسوی ۔ راولپنڈی

الاقربا کا جنوری، مارچ ۲۰۰۴ء کا شمارہ باصرہ نواز ہوا، جس میں میرا ایک مضمون بھی شائع فرمایا ہے ۔ جس کے لئے شکر گزار ہوں، اس دفعہ "فارسی شعر و ادب میں برصغیر کے اہل قلم کا حصّہ" کے موضوع پر ایک مقالہ ارسال خدمت ہے ۔ حالیہ شمارے کے مقالات میں سے بیشتر فارسی زبان و ادب اور اقبال شناسی سے متعلق ہیں اور مختلف مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے موضوع کو بہت دلچسپ پیرائے میں نذر قارئین کیا ہے

☆ ہم فاضل مراسلہ نگار کے نہایت شکر گزار ہیں کہ انہوں نے نکات زیر بحث پر اپنے عالمانہ تجزیہ سے ہمیں اور قارئین کرام کو مستفید فرمانے کی سعی فرمائی ۔ تاہم اس ضمن میں کسی بھی غلط فہمی کے ازالہ کی خاطر چند معروضات پیش خدمت ہیں ۔

(الف) اس میں شک نہیں کہ لفظ "کیفیت" اور دیگر زیر بحث الفاظ کو مختلف شعرائے کرام نے مشدّد اور غیر مشدّد دونوں طرح نظم کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ معروف و مستند لغات کے مرتبین / مولفین نے درست کس شکل کو قرار دیا ہے چنانچہ لفظ "کیفیت" کے مشدّد ہونے پر اتفاق رائے ملاحظہ فرمایئے (جامع اللغات ۔ علمی اردو لغت ۔ فرہنگ آصفیہ ۔ لغات نظامی اردو ۔ نور اللغات ۔ نسیم اللغات ۔ فیروز اللغات وغیرہ) محض کسی لفظ کے شعراء کے ہاں غلط استعمال سے اسے درست نہیں گردانا جا سکتا ۔ مثلاً غالب جیسے جید شاعر نے لفظ "کافِر" کو کافَر" نظم کیا تو اسے مثال نہیں بنایا گیا ۔

غالب کا شعر ہے : حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے آخر گناہ گار ہوں کافَر نہیں ہوں میں

(ب) محترم سرور انبالوی نے جن کا باقاعدہ قلمی تعاون ہمیں حاصل ہے اپنے مراسلہ (مطبوعہ الاقرباء جنوری تا مارچ ۲۰۰۴ء) کے ذریعہ صرف اسی اصلاح شدہ مصرع کو نقل کرنے پر اکتفا کیا جو انکی مطبوعہ غزل کے مطلع کا مصرع ثانی ہے چنانچہ 'طرح' کو 'طرحا' پڑھے جانے سے جس بحر کا اطلاق ہوتا ہے وہ یہ ہے ۔

فاعلاتن ۔ فاعلاتن ۔ فاعلاتن ۔ فاعلن اگر موصوف پورا شعر نقل فرما دیتے تو غلط فہمی کا امکان پیدا نہ ہوتا ۔

(ج) قدْر بمعنی اندازہ، مقدار، عزت، وقعت وغیرہ اور قدَر بمعنی تقدیر، حکم الٰہی وغیرہ ہر دو کے مختلف تلفظ اور مختلف معانی پر تمام لغات متفق ہیں (مثلاً جامع اللغات، علمی اردو لغت، فرہنگ آصفیہ، مختصر اردو، لغت (ترقی اردو بیورو دہلی) لغات نظامی، نور اللغات، نسیم اللغات، فیروز اللغات، فرہنگ عامرہ، وغیرہ بشمول شان الحق حقی کی مرتبہ فرہنگ تلفظ مطبوعہ ۱۹۹۵ء)

اسلئے سند صحت صرف لغوی معانی و تلفظ کو حاصل ہے البتہ "غلط العام" کے تصور کے تحت بعض ارباب شعر و ادب کے یہاں مختلف حیثیتوں میں بکثرت استعمال کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا ۔ ہر چند کہ فوقیت لغوی تلفظ اور معانی ہی کو حاصل رہے گی ۔

(د) فاضل مراسلہ نگار نے لفظ تربیت کے غیر مشدّد استعمال کے ضمن میں منجملہ دیگر امثال حکیم الامتؒ کے ایک شعر کو اس طرح نقل فرمایا ہے ۔ "خودی کی تربیت و پرورش پہ ہے موقوف کہ مشت خاک میں پیدا ہو آتش پُر سوز"

اصل شعر میں "آتش پُر سوز" نہیں بلکہ "آتش ہمہ سوز" استعمال ہوا ہے کہ آتش تو خود ہی سراپا سوز ہوتی ہے البتہ دل پُر سوز یا "آہ پُر سوز" کی تراکیب درست ہیں ۔ (ضرب کلیم صفحہ ۷۵) (ادارہ)

جن میں عارف دہلوی نے حق مطلب ادا کیا ہے۔ عظمت رفتہ کی سرزمین اوچ معلومات مضمون ہے۔ دیگر مقالہ نگاروں کی کاوشیں بھی لائق ستائش ہیں۔ سب سے بڑھ کر آپ کی ادب دوستی اور زحمات کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں اور مبنی بر حقیقت تبصرہ ہے۔ جس صحافت کو اب صنعت کا درجہ دیا جاتا ہے وہ ہماری سماجی اور اخلاقی قدروں کی پامالی پر استوار ہے۔ مرحوم شورش کاشمیری نے کئی عشرے قبل اس کو ''سرخی پوڈر کی صحافت'' سے تعبیر کیا تھا۔ آخر میں : خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!

آپ نے سہ ماہی الاقربا کے ذریعے جو علمی اور ادبی خدمت کا بیڑہ اٹھایا ہے وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ پروف پڑھنے کے کام کو زیادہ محنت اور وقت سے انجام دیا جائے خالصہ شمارہ کے صفحہ ۵۵ پر حوالہ جات کے نمبر ۴ پر کتاب اور مصنف دونوں کے نام صحیح نہ چھپ سکے جو یہ ہیں: ۔ ۴۔ یاقوت حموی، معجم البلدان۔

مجھے امید ہے کہ یہ یاد آوری ملال خاطر کا باعث نہیں بنے گی۔ فارسی کی ایک ضرب المثل کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ جس جگہ سے نقصان کا راستہ روک دیا جاتا ہے وہیں سے منفعت شروع ہو جاتی ہے۔

امین راحت چغتائی۔ راولپنڈی

سہ ماہی ''الاقرباء'' کا (جنوری۔ مارچ ۲۰۰۴ء) شمارہ ملا۔ یاد آوری کے لئے تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ آپ ایسے صاحب علم و دانش اور خوش ذوق ادیب سے ایسے ہی ''خوش خصال'' مجلّے کی توقع تھی پرچے میں کچھ اپنے'' جگر کے ٹوٹے'' بھی نظر آئے جن کو پڑھ کر مزید خوشی حاصل ہوئی۔ ان میں عبدالحمید اعظمی، پرتو روہیلہ، پروفیسر فتح محمد ملک اور نوید ظفر بطور خاص شامل ہیں۔ اللہ آپ سب کے درجات بلند فرمائے۔ اس موقع پر اپنے مرحوم دوست روشن نگینوی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ آپ بھی سن لیجئے

ہے بقدر ظرف ہر شے محترم اپنی جگہ جام مے اپنی جگہ اور جام جم اپنی جگہ

پروفیسر خیال آفاقی۔ کراچی

الاقربا کو دیکھ کر میرے اس یقین کو بڑی تقویت ملتی ہے کہ مادیت کا سیلاب بلاخیز سب کچھ بہا کر نہیں لے گیا بلکہ۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

بلاشبہ اس دور طلسمات میں ایک ادبی پرچے کا وجود بذات خود ایک طلسم اور عجوبہ ہے اور اس کار عجیب کی جتنی تحسین کی جائے کم ہے۔ میری دعا ہے اللہ رب العزت آپ اور آپ کے عزائم کو پیہم جواں رواں رکھے۔

سید صاحب! الاقربا جس خدوخال کے ساتھ نظر آتا ہے بہت خوب ہے۔ تاہم خوب سے خوب تر

کی آرزو کا تقاضا ہے کہ اس پر مزید توجہ دی جائے خصوصاً نظم کا شعبہ خاصی توجہ اور اصلاح کا محتاج ہے یعنی بلا تکلف یہ کہا جا سکتا ہے کہ الاقرباء میں چھپنے والی شاعری کوئی قابل رشک نہیں ہوتی وہی گھسے پٹے خیالات اور فرسودہ مضامین، کوئی تنوع کوئی نیا پن نہیں، اس پر ایک ہی شاعر کی ایک سے زیادہ غزلیں، نہیں معلوم اس ''پیشکش'' میں کیا مصلحت اور حکمت کارفرما ہے۔ نثر کا حصہ جو تحقیق و تالیف پر مبنی ہے قابل تعریف ہے۔ فکشن بھی کسی حد تک گوارا ہے۔ لیکن شاعری؟ نہیں صاحب، زیادہ تر قافیہ بندی کے سوا کچھ نہیں۔ اب دیکھیے زیرنظر شمارے میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جن کی اگر صاحبان شعر خود بھی نثر کرنا چاہیں تو کوشش بسیار کے بعد بھی معنی ہاتھ نہ آئیں۔ لحاظ و ادب مانع ہے ورنہ اس وقت بھی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن انیس کے مشورہ پر عمل پیرا ہوں اور خیال خاطر احباب پیش نظر ہے اور آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہے۔ تاہم اس موقع پر ایک اور موضوع کو آپ سے مکالمت کا عنوان بنانے کی جسارت کرتا ہوں، یعنی آپ اس حقیقت سے تو بخوبی آگاہ ہیں کہ ہمارے قدیم اور جدید شعراء میں سے کچھ حضرات شغل مے کشی کو اپنا حق اور اپنے لئے اس فعل کو جائز اور روا سمجھتے آئے ہیں بلکہ بعض تو اپنی اس بادہ خواری پر نازاں اور فرحاں دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ کتاب نعمت میں اس قماش کے افراد کو شرابی کبابی، نشئی بھنگڑی اور حال موالی وغیرہ لکھا گیا ہے۔ معاشرے میں بھی پینے پلانے والوں کو اسی نام سے پکارا جاتا ہے لیکن یہ کیا عجب ہے کہ دھڑلے سے پینے اور جام لنڈھانے والے شعراء پر اس لعنت کا اطلاق نہیں ہوتا اور انہیں سات خون معاف کر دیئے گئے ہیں کیونکہ ان رند خرابات کے پرستار اور ممدوحین ان کی مکروہات کو ان کی خوبی بنا کر پیش کرتے اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں ان کی مے نوشی کے قصے چسکے لے لے کر بیان کرتے نہیں تھکتے۔ ان خردمندوں کو اتنا بھی خیال نہیں آتا کہ ایک چیز جو عوام کیلئے برائی اور خرابی کا باعث ہے وہی خواص کیلئے ثواب اور خوبی کا سبب کیوں کر ہو سکتی ہے کیا ایک شاعر کا شعر ہمیں اس لئے پسند ہے کہ وہ پیتا پلاتا ہے اور ہم اگر اس کی شاعری کے ساتھ اس کی میکشی کے بھی مداح ہیں تو کیا ہم اپنے اندر عقل کا فقدان محسوس نہیں کرتے۔ یقیناً وہ شخص دماغی طور پر کہاں تک صحت مند کہلانے کا مستحق ہے جو ایک مذہبی اور سماجی برائی کے حق میں اس طرح رطب اللسان دکھائی دے کہ گویا انسان اور خصوصاً ایک شاعر کے اندر اس سے بڑا وصف اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا اور اچھی شاعری تو اس کے بغیر ممکن ہی نہیں یعنی ''کلاسک'' شاعری کو وہی تخلیق کر سکتے ہیں جو گھڑی اور گھڑا سامنے رکھ کر پینے کی صلاحیت اور ظرف رکھتے ہیں۔

محترم! اس طولانی تمہید کی معذرت چاہتے ہوئے گزارش یہ کرنا چاہتا ہوں کہ زیرِ نظر شمارے میں اسی فیشن ایبل غلطی کا اعادہ کیا گیا ہے اور اس مغالطہ کا شکار ایک ڈاکٹر صاحب ہوئے ہیں جو خیر سے خود صاحب علم اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اسی بات کا ہمیں افسوس ہے اور لب کشائی پر مجبور ہیں ورنہ ایسے ویسے کی بات پر کون کان دھرتا اور توجہ دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے ممدوح غالب ہیں آپ ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں

وجدان و کیف غالب خستہ کی جان ہے ساغر، قلم، کتاب ہی ان کے نشان تھے

یعنی غالب کی شناخت محض کتاب اور قلم سے نہیں بلکہ اس فہرست میں ساغر کو اولیت حاصل ہے کہ جب تک غالب کو ساغر اور صراحی کے حوالے سے نہیں سمجھا جائے گا ان کے وجدان اور کیفیت کا اندازہ لگانا محال ہے ڈاکٹر صاحب کے نزدیک شراب کا پیالہ بھی کتاب اور قلم کی طرح مقدس ہے بلکہ یہی وہ ماسٹر کی ہے جس کے ذریعے وجدان و کیفیت کے قفل وا ہوتے ہیں لطف کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ممدوح خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اس ضمن میں ایک اور جگہ ڈاکٹر صاحب اعلان کرتے ہیں کہ: غالب تھے مے پرست بھی مست الست بھی

یعنی غالب کی بڑائی اور ان کی شعری عظمت کا راز ہی فی الاصل یہ ہے کہ وہ مے پرست اور مست الست شاعر تھے اور ان کی اس ''خوبیٔ عظمیٰ'' کا اظہار کئے بغیر ان کے مقام کا تعین ممکن نہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے اس پر بس نہیں کیا بلکہ غالب کے وطن ثانی دلی کی پہچان کو بھی ساغر کا محتاج قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں

ساغر چلے تو غالب و دہلی کی بات ہو

اس موقع پر یہ مشہورِ زمانہ مصرعہ دہرانے کے سوا چارہ نہیں کہ: ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے

ہمارے ہاں اچھا، معیاری اور صاف ستھرا ادب تخلیق کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ اسی شمارے میں قمر رعینی صاحب بطور مثال میرے سامنے موجود ہیں۔ کیا خوب رباعیات ہیں۔ سبحان اللہ، صاف ستھری با مقصد اور مفید ...... محترم پرتو روہیلہ کی غزلیات بھی زبان و بیان کا عمدہ نمونہ پیش کر رہی ہیں جبکہ موصوف غالب کی دنیا کی خوب سیر کر چکے آپ کی دونوں غزلوں کا ایک ایک شعر اپنی پسند کی چھاپ لگا کر پیش کر رہا ہوں۔

عالم ہے ایک مقبرہ خوبیٔ وصفا کب تک مزارِ ذات پہ رویا کرے کوئی

کوئی بگولہ سا اٹھتا دکھائی دیتا ہے کہیں قریب ہی صحرا دکھائی دیتا ہے

سید رفیق عزیزی کی غزل بھی شروع تا آخر بہت ہی تنوع لئے ہوئے ہے۔ سیف الرحمٰن سیفی کے تیور بتا رہے کہ وہ اپنی فکر میں طرحداری رکھتے ہیں۔

مشل چراغ بزم میں لا کر پھر اس کے بعد   دشنام کی ہوا سے بجھایا گیا ہوں میں

تو ہے یا پھر کوئی تیرے جیسا ہوتا ہے   رات گئے جو دل کے اندر بولنے لگتا ہے

جناب سلطان صبروانی کی غزل کا جب یہ شعر بھی اپنے خالق کی تعریف کرانے پر مجبور کرتا دکھائی دیتا ہے۔

کب تک رہوں میں گوش بر آواز کچھ کہو   سنتا رہوں میں چپ کی صدا اور کتنی دیر

آخر میں وہ بات جو مجھے پہلے کہنی چاہیے تھے۔ آپ کا اداریہ ہے جو فی الاصل، ضمیر کی عدالت میں، قلم کے حق میں ایک موثر استغاثہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ☆

☆ محترم مراسلہ نگار کا کرم کہ وہ "الاقرباء" کو خصوصی توجہ کا مستحق سمجھتے ہیں چنانچہ ہمیں اپنے گراں قدر مشوروں سے بھی سرفراز فرمایا ہے تاہم ہم موصوف کے اٹھائے گئے نکات پر مختصراً اپنی رائے پیش کرنے کی جسارت اس لئے کر رہے ہیں کہ ہمارے بعض معزز قارئین کہیں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔

☆ موصوف نے اپنی ایک ہی تحریر میں "الاقرباء" کو واجب التعریف اور سزاوار تعزیر ٹھہرایا ہے۔ ہر چند کہ یہ تضاد ہمارے لئے باعث استعجاب ہے۔ بہرکیف ہم ہر دو صورتوں میں موصوف کے شکر گزار ہیں۔

☆ موصوف نے الاقرباء میں چھپنے والی شعری نگارشات کو نا قابل رشک گھسے پٹے خیالات اور فرسودہ مضامین پر محمول فرمایا ہے حالانکہ اس مکتوب گرامی ہی میں آپ نے کم و بیش نصف درجن شعراء کی توصیف و تحسین فر، ہے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے   ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

☆ موصوف نے "ازرہ عنایات شا رانہ" ہمیں اپنی ایک غزل بھی ارسال فرمائی ہے جو زیر نظر شمارہ کی زینت ہے کیا موصوف ہمیں اجازت مرحمت فرمائیں گے کہ ہم "الاقرباء" میں چھپنے والے شعرائے کرام کی توجہ اس غزل کی طرف بطور مثال مبذول کرائیں کہ آئندہ اپنی نگارشات ارسال کرتے وقت اس "نمونہ" کو پیش نظر رکھا کریں۔ حالانکہ موصوف یقیناً جانتے ہوں گے کہ ان شعرائے کرام میں اس عہد کے نہایت معتبر و معروف نام بھی شامل ہیں۔

☆ موصوف شاعری میں "مے و جام" کے ذکر پر سخت برہم ہیں حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو   بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اردو فارسی شاعری اپنے بیشتر حسن کیلئے ان استعاروں اور علامات کی مرہون منت ہے حد ہے حافظ و سعدی جیسے بزرگ اور امیر مینائی و ریاض خیر آبادی جیسی متقی و پرہیزگار ہستیاں بھی ان الفاظ سے صرف نظر نہیں کر سکیں قطع نظر اس کے کہ ان کا پس منظر شراب اصلی ہے یا شراب معرفت۔

☆ موصوف کا اصل ہدف ہمارے ایک محترم شاعر اور انہیں کے ہم نام یا ہم تخلص معلوم ہوتے ہیں۔ خدا معلوم اس تصادم "خیالی بہ خیال" کا پس منظر کیا ہے؟

☆ ہم ممنون ہوں گے اگر صاحب مراسلہ "الاقرباء" میں چھپنے والے اُن اشعار کی نشاں دہی فرما دیں جن کے متعلق وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔ "نہیں صاحب! قافیہ بندی کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جن کی اگر صاحبانِ شعر خود بھی نثر کرنا چاہیں تو کوششیں بسیار کے بعد بھی معنی ہاتھ نہ آئیں"۔ (ادارہ)

ڈاکٹر غلام شبیر رانا۔ جھنگ

سہ ماہی ''الاقرباء'' موصول ہوا۔ میں اس کرم کے لئے سپاس گزار ہوں۔ اس قدر معیاری مجلّے کی اشاعت آپ کی محنت، لگن اور جوہر شناسی کا ثبوت ہے۔ میں مجلس ادارت ومشاورت کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے ''الاقرباء'' تخلیق ادب کے سلسلہ میں خوب سے خوب تر کی جانب اپنا سفر جاری رکھے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس وقیع ادبی مجلّے کے لئے کچھ لکھوں۔ انشاءاللہ جلد ایک مضمون روانہ کروں گا۔

محمد زعیم الحق حقّی۔ اسلام آباد

حافظ شیرازیؒ سے متعلق ایک مضمون سہ ماہی 'الاقرباء' کی گزشتہ اشاعت میں نظر سے گزرا جس میں صاحبِ مضمون نے انکشاف کیا کہ حافظ شیرازیؒ کے کلام کا اردو ترجمہ امریکہ میں ایک پاکستانی نے حال ہی میں کیا ہے۔

اس سلسلہ میں قارئین الاقرباء کی معلومات کے لئے میں یہ بتانا چاہوں گا کہ مشہور شاعر ونقاد ڈاکٹر شان الحق حقّی کے والد بزرگوار نے جو خود بھی ایک منجھے ہوئے شاعر تھے اور جن کا نام محمد احتشام الدین حقّی تھا حافظ کے کلام کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا جو اُس دور کے ایک مجلّہ میں شائع بھی ہوا۔ اس ترجمہ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ یہ انہیں بحور میں تھا جن میں حافظ نے اپنا کلام مرتب کیا۔

خبرنامہ الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کیلئے)

مرتبہ

شہلا احمد

احوال وکوائف

☆ مجلس عمومی کا سالانہ اجلاس

مجلس عمومی الاقرباء فاونڈیشن کا ساتواں سالانہ اجلاس مورخہ ۲۱ فروری ۲۰۰۴ء بروز ہفتہ سرسید میموریل کمپلیکس آڈیٹوریم اسلام آباد میں منعقد ہوا۔ گزشتہ سالوں کی طرح اس مرتبہ بھی ممبران کی اکثریت نے اپنے اہل خانہ، عزیز واقارب اور مہمانان گرامی کے ہمراہ شرکت کی۔ اس کے علاوہ دنیائے علم وادب کی معروف شخصیات نے اس تقریب کو رونق بخشی۔ اجلاس کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا اس کے بعد رسولِ اقدسؐ کے حضور ہدیہ نعت پیش کیا گیا۔ ازاں بعد فاوئنڈیشن کی سالانہ کارکردگی کے حوالے سے رپورٹ پیش کی گئی اور پھر مجلس انتظامیہ کی خالی نشست پُر کرنے کے لئے انتخاب ہوا۔ کچھ

مجلس عمومی کے ساتویں سالانہ اجلاس کے سامعین کا ایک گوشہ

اور معمول کے پروگرام فاوئنڈیشن کی گزشتہ سرگرمیوں کے بارے میں پیش کرنے کے بعد ایک خوبصورت ثقافتی پروگرام پیش کیا گیا جس میں تمام اراکین اور ان کے اہل خانہ نے جوش وخروش سے حصہ لیا اور انعامات جیتے۔ اس کے علاوہ تعلیمی شعبہ میں بہترین کارکردگی پر حسب سابق طلباء طالبات کوشیلڈز دی گئیں اور آخر میں پرتکلف عشائیہ سے تواضع کی گئی۔

☆ مجلس انتظامیہ کے نومنتخب رکن: جناب سید محمد حسن زیدی

مجلس عمومی کے اجلاس کے موقع پر حسب روایت مجلسِ انتظامیہ کی ایک خالی نشست کے لئے

انتخاب ہوا جس پر سید محمد حسن زیدی صاحب بلا مقابلہ کامیاب قرار پائے۔ آج کل وفاقی حکومت میں جوائنٹ سیکرٹری کی حیثیت میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

☆ مجلس عمومی میں ممبر سازی

سال گزشتہ کی طرح اس سال بھی فاونڈیشن میں ممبر سازی کافی سست رہی اور بمشکل چند ممبران کا اضافہ ہوسکا، محمد جمال ناصر خان جو حال ہی میں کراچی سے اسلام آباد پوسٹ ہو کر آئے ہیں الاقرباء فاونڈیشن کی سرگرمیوں سے بہت متاثر ہوئے ہیں اور اس میں شمولیت کی خواہش ظاہر کی۔ جس کا احترام کیا گیا۔ چنانچہ اب وہ الاقرباء فاونڈیشن کے ممبران کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔ وہ بیگم شہلا احمد کے بھائی ہیں اور پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اسلام آباد میں بحیثیت سسٹم اینالسٹ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حال ہی میں فاونڈیشن میں دو ننھے منے ممبران کا اور اضافہ ہوا ہے۔ جن میں ایک صدر الاقرباء فاونڈیشن کے پوتے جن کی عمر صرف چند ماہ ہے سید محمد احسن منصور اور دوسرے آپ کے نواسے عزیزہ محمد صباحت منصور اور عزیزی ڈاکٹر صمد تجمل ہاشمی کے فرزند دانیال تجمل ہاشمی ہیں جو انگلستان کے شہر برنسلے میں مورخہ ۱۵ فروری ۲۰۰۴ء بروز اتوار پیدا ہوئے۔ اس موقع پر نومولود کی دادی بیگم تجمل ہاشمی اور نانی محترمہ ناہید منصور کے علاوہ پھوپھی محترمہ حمیدہ تجمل ہاشمی بھی پاکستان سے برنسلے (انگلستان) پہنچ گئیں۔

☆ اسٹوڈنٹ آف دی ایئر کا اعزاز:

سال رواں سے الاقرباء فاونڈیشن نے طلباء کے درمیان ایک مقابلہ اسٹوڈنٹ آف دی ایئر (Student of the year) کے نام سے شروع کیا ہے۔ اس میں فاونڈیشن کے زیر تعلیم بچوں کی سارا سال کی تعلیمی سرگرمیوں اور غیر معمولی کامیابیوں کا جائزہ لیا جائے گا اور بہترین ریکارڈ کے حامل طالب علم کی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشنے اور حوصلہ افزائی کیلئے (Student of the year) کے خطاب وانعام سے نوازا جائے گا۔ اس سلسلے کا پہلا انعام شیلڈ کی شکل میں ہالہ صابری نے حاصل کیا اور Student of the year کہلائیں۔

☆ محترم جی اے صابری کی ترقی

محترم جی اے صابری رکن مجلس انتظامیہ الاقرباء فاونڈیشن کو جو وزارت پٹرولیم وقدرتی وسائل میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز ہیں اسی پوسٹ پر گریڈ اکیس میں ترقی دے دی گئی ہے۔

آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے کیمیکل انجینئرنگ میں ماسٹرز کیا ہے اور وہ واحد ڈائریکٹر جنرل ہیں جو اپنی سروس کے تیس سالہ دور میں وزارت پٹرولیم کے تمام ڈائریکٹوریٹس میں خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

ادارہ اس مبارک موقع پر جناب جی اے صابری اور تمام اہل خانہ کو دلی تہنیت پیش کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں جناب وبیگم صابری نے سرسید میموریل کمپلکس کے سبزہ زار پر ایک پُرتکلف ضیافت کا بھی اہتمام کیا۔

☆ تعلیمی سفر کی پہلی منزل

الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن جناب اطہر اسلام وبیگم مریم اطہر کے صاحبزادے عزیزی رمان جان اطہر نے جو خود بھی فاؤنڈیشن کے رکن ہیں۔ اپنے تعلیمی سفر کی پہلی منزل (نرسری کلاس) نہایت شاندار طریقے سے طے کر لی ہے۔ انہوں نے ۳۲۵ میں سے ۳۰۷ (۹۴٫۴ فیصد) نمبر حاصل کئے ہیں اور کلاس میں انکی مجموعی کارکردگی Excellent رہی ہے۔ وہ اسلام آباد کونونٹ اسکول ایف ۴/۸ کے طالب علم ہیں۔

☆ عفیفہ منیر کا اعزاز

سہ ماہی ''الاقرباء'' کے مدیر جناب محمود اختر سعید کی نواسی عفیفہ منیر نے اسلام آباد کالج فار گرلز ایف ۲/۶ کے سالانہ کانووکیشن کے موقع پر Outstanding Graduates, Session 2001-03 کے سلسلے میں ''رول آف آنر'' وفاقی وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال کے دست مبارک سے وصول کیا۔ ادارہ اس اعزاز پر جناب محمود اختر سعید، عفیفہ منیر اور ان کے والدین کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

آنسہ عفیفہ منیر طالبہ اسلام آباد کالج فار گرلز ایف ۲/۶ وفاقی وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال سے ''رول آف آنر'' وصول کرتے ہوئے

☆ شادی خانہ آبادی

الاقرباء فاونڈیشن کے رکن جناب ڈاکٹر ایم ایم شیخ و بیگم نجمہ عفت جعفری کے فرزند ارجمند محمد ھیشم مکی کی رسم نکاح مورخہ ۱۰ جولائی ۲۰۰۳ بروز جمعہ فیصل مسجد اسلام آباد میں منعقد ہوئی ۔ ان کی شریک حیات عزیزہ جویریہ سید اطہر زیدی صاحب ڈائریکٹر جنرل فنانس اینڈ ایڈمنسٹریشن انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کی دختر نیک اختر ہیں جبکہ وہ خود سیکوریٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن آف پاکستان میں بطور ڈائرکٹر خدمات انجام دے رہی ہیں ۔ محمد ھیشم مکی چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ہیں ۔ ۱۱ فروری ۲۰۰۴ کو عزیزہ جویریہ کی تقریب رخصتی ہالیڈے ان اسلام آباد میں ہوئی اور ولیمہ کی تقریب کا اہتمام KRL آفیسرز کالونی کلب ہال میں کیا گیا۔

☆ تعلیمی شعبہ میں بہترین کارکردگی پر انعامات:

حسب سابق اس مرتبہ بھی سالانہ اجلاس کے موقع پر محترم سید آفتاب احمد اور بیگم طیبہ آفتاب نے تعلیمی شعبہ میں بہترین کارکردگی کے حامل طلباء و طالبات کی حوصلہ افزائی کے لئے اعترافی شیلڈز دیں اور یہ شیلڈز آنسہ عامرہ صدیقی نے انٹرمیڈیٹ میں ۸۳۰ نمبر پر A گریڈ میں کامیابی پر، مجاہد حسن نے BCS میں نمایاں کامیابی پر، صبا صدیقی نے بی بی اے آنرز میں ۹۸.۳ سی جی پی اے کے ساتھ کامیاب ہونے پر اور ہالہ صابری نے 'o' لیول میں پانچ As لے کر حاصل کیں۔

سید نعیم احمد

سیکرٹری جنرل

سالانہ رپورٹ ۲۰۰۳ء

معزز اراکین واہل خانہ اسلام وعلیکم

اللہ کے فضل سے اور آپ لوگوں کے تعاون سے الاقرباء فاؤنڈیشن کو ۶ سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے اور آج ہم مجلس عمومی کا ساتواں اجلاس منعقد کر رہے ہیں جیسا کہ آپ کے علم میں ہے ادارہ کا بنیادی مقصد اراکین کے درمیان سماجی سرگرمیوں کے علاوہ باہمی رواداری کو فروغ دینا ہے۔

گزشتہ سال اراکین کے لئے کچھ زیادہ پروگرام ترتیب نہیں دیئے جاسکے جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں پچھلے سال ادارہ کی جو سرگرمیاں رہیں ان کا مختصر احوال کچھ اس طرح ہے کہ اپریل کے مہینے میں ایک تفریحی و تعلیمی سیاحت کا اہتمام کھیوڑہ سالٹ مائنز پر کیا گیا جس میں ادارہ کے اراکین واہل خانہ نے کافی تعداد میں شرکت کی اس پروگرام کو اراکین واہل خانہ نے بہت پسند کیا جس کی تفصیل سہ ماہی الاقرباء میں بھی چھپ چکی ہے۔

گزشتہ سال ربیع الاول کے موقع پر ایک نعتیہ مشاعرے کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں اسلام آباد وپنڈی کے ممتاز شعراء اکرام نے شرکت کی اس پروگرام میں بھی اراکین واہل خانہ کے علاوہ کافی تعداد میں مہمانان گرامی نے بھی شرکت کی اور پروگرام کو بے حد سراہا۔ مجلس انتظامیہ کے ماہانہ اجلاس پابندی کے ساتھ ہر رکن کے گھر پر منعقد ہوتے رہے ہیں۔

سہ ماہی الاقرباء کی اشاعت بھی پابندی کے ساتھ جاری ہے۔ اور اللہ کے فضل سے اس کا شمار اب ملک کے صفحہ اول کے علمی وادبی جرائد میں ہونے لگا ہے گو کہ ابھی تک اس سہ ماہی سے ادارہ کو خاطر خواہ آمدنی حاصل نہیں ہو رہی لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ سہ ماہی اپنے اخراجات میں خود کفیل ہو چکا ہے اسے پابندی کے ساتھ ملک کے ممتاز اسکالروں اور ملک کی تمام لائبریریوں میں بھیجا جاتا ہے آپ لوگوں سے گزارش ہے کہ آپ خود بھی اس کا زر تعاون ادا کریں جو صرف ۲۵۰ روپے سالانہ ہے اور اپنے احباب وعزیز واقارب کو ترغیب دیں کہ وہ اس علمی وادبی معیاری مجلے سے تعاون کریں۔

سہ ماہی میں خبر نامہ کا حصہ اراکین الاقرباء کے لئے مختص ہے آپ لوگ اس کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ لکھیں۔ سال ۲۰۰۲ء کی طرح گزشتہ سال بھی رکنیت سازی کی رفتار حد درجہ سست رہی ہے اور سال ۲۰۰۲ میں صرف ۳ افراد ممبر بنے میں ادارہ کی طرف سے ان نئے ممبران اور ان کے اہل خانہ کو خوش آمدید کہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کے مفید مشوروں سے ادارہ کی سرگرمیوں کو فروغ حاصل ہوگا۔ آپ لوگوں سے درخواست ہے کہ اپنے عزیز و اقارب کو زیادہ سے زیادہ ممبر بنوائیں تا کہ ادارہ کے فلاحی پروگراموں کی تشکیل و تکمیل کے لئے افرادی قوت و وسائل میسر آسکیں ہر سال کی طرح ادارہ کے زکوۃ فنڈ میں سے گزشتہ سال بھی ضرورت مند لوگوں کو مالی امداد کے علاوہ کپڑے اور دیگر اشیاء بھی انفرادی طور پر مہیا کی گئیں اس سلسلے میں تمام اراکین سے درخواست ہے کہ اپنی زکوۃ میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ادارہ کے لئے بھی رکھیں تا کہ ہماری سماجی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوسکے گزشتہ سال مبلغ ۱۵۰۰۰ ہزار روپے ملک کے ایک ممتاز اہل قلم کو دیئے گئے اگر آپ میں سے کوئی رکن کسی مستحق شخص کو زکوۃ فنڈ میں سے کچھ رقم دینا چاہے تو سیکرٹری جنرل کو تحریری طور پر مطلع کرے۔ گزشتہ سال کل ۱۵۰۰۰ ہزار روپے زکوۃ فنڈ میں موصول ہوئے جبکہ ۶۲۰۰ روپے سال ۲۰۰۲ کے موجود تھے اس وقت ۶۱۰۰ روپے زکوۃ فنڈ میں موجود ہیں۔

سالانہ رپورٹ کے بعد اب آپ کے سامنے گزشتہ سال ۲۰۰۳ کا میزانیہ پیش کرتا ہوں۔ اس سال بھی سیکریٹری مالیات کا اضافی قلم دان میرے پاس رہا سال ۲۰۰۳ کے حسابات کا گوشوارہ کچھ اس طرح ہے۔

یکم جنوری ۲۰۰۳ کو ادارہ کے فنڈ میں کل ۱۰۹۱۸۵ روپے موجود تھے اور ۳۱ دسمبر ۲۰۰۳ کو یہ رقم ۱۳۱۷۰ روپے ہوگئی۔ گزشتہ سال کل آمدنی ۱۲۰۳۵۰ روپے ہوئی جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

ممبر شپ کی مد میں	۳۰۰۰
اشتہارات سہ ماہی	۱۰۸۵۵۰
اسٹالوں پہ سہ ماہی کی فروخت	۸۰۰
سالانہ زرتعاون	۸۰۰۰
کل آمدنی	۱۲۰۳۵۰

گزشتہ سال کے دوران کل اخراجات ۱۱۵۲۶۵ روپے رہے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

سہ ماہی کی اشاعت معہ ڈاک خرچ	۹۹۳۹۹

کھیوڑہ سالٹ مائنز پر اضافی خرچہ	۳۴۵
نعتیہ مشاعرہ پر اضافی خرچہ	۵۴۰۰
مجلس عمومی کے اجلاس برائے ۲۰۰۲ پر اضافی خرچہ	۹۷۲۱
متفرق اخراجات	۸۰۰
کل خرچہ	۱۱۵۶۶۵

پچھلے سال کے آغاز پر آمدنی کا تخمینہ ۳۰۰،۰۰۰ روپے لگایا تھا جبکہ ہمیں ۲۰،۳۵۰،ا روپے کی آمدنی ہوئی اور اخراجات کا تخمینہ ۵۰۰۰،۷ا روپے تھا جبکہ ۱۱۵۶۶۵ روپے صرف ہوئے۔

میں امید کرتا ہوں کہ اگر آپ لوگوں کا تعاون شامل رہا تو آئندہ سال ۳۰۰،۰۰۰ کی آمدنی ہوگی اور خرچہ ۱۵۰،۰۰۰ روپے متوقع ہے۔

آخر میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ آئین کی رو سے ادارہ کا کوئی بھی رکن کسی بھی وقت حسابات کا جائزہ لے سکتا ہے۔ شکریہ

صائمہ خیری

مختصر نظم

کتنی محبت کرتی ہو تم
میرے پیارے ابّو سے
اچھی امی
اللہ تم کو
سدا سہاگن رکھے

(مرسلہ عطیفہ منیر۔ اسلام آباد)

رپورٹ

شہلا احمد

مجلس عمومی کا سالانہ اجلاس اور دلچسپ و رنگارنگ ثقافتی پروگرام

الاقرباء فاؤنڈیشن ہر سال نہایت پابندی سے مجلس عمومی کا اجلاس منعقد کرتی ہے' جس کا بنیادی اور نہایت اہم مقصد تمام ممبران کو ایک دوسرے سے ملاقات کا موقع فراہم کر کے ان کے درمیان محبتوں کو فروغ دینا ہے۔ الاقرباء فاؤنڈیشن اپنی حیات کے سات سال نہایت کامیابی سے طے کر چکی ہے' اس دوران اس نے اپنے اراکین ان کے اہل خانہ اور احباب کیلئے گوناگوں تفریحی، تعلیمی، ادبی اور ثقافتی پروگرام' کبھی پکنک پارٹیز کی شکل میں تو کبھی ادبی محافل کی صورت میں' کبھی قومی اہمیت کے دن منا کر تو کبھی مبارک مذہبی تقاریب کا انعقاد کر کے' کبھی اسپورٹس ڈے ترتیب دے کر تو کبھی مینا بازار سجا کر ان کی ذہنی جسمانی اور روحانی تربیت کی کوشش کی ہے اور ان تمام کوششوں میں مجلس عمومی کے سالانہ اجلاسوں نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے کہ ان میں اراکین کی ایک بڑی اکثریت اپنے اہل خانہ کے علاوہ دوسرے عزیز و اقارب اور مہمانانِ گرامی کے ہمراہ شرکت کرتی ہے۔

الاقرباء فاؤنڈیشن کی مجلس عمومی کے ساتویں سالانہ اجلاس کے سٹیج کا منظر (بائیں سے دائیں) جناب جلیس احمد صدیقی' سامعین سے مخاطب ہیں' جبکہ سٹیج پر تشریف فرما ہیں' سید ممتاز اللہ سالاری (نائب صدر)' سید منصور عاقل (صدر)' سید نعیم احمد (سیکرٹری جنرل) اور سید آفتاب احمد (رکن مجلسِ انتظامیہ)

۲۱ فروری ۲۰۰۴ء بروز ہفتہ اس سلسلے کا ساتواں اجلاس سر سید میموریل کمپلیکس آڈیٹوریم اسلام آباد میں منعقد ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی اراکین کی بڑی تعداد نے اپنے اہل خانہ اور مہمانان گرامی کے ہمراہ اس میں شرکت کی اس کے علاوہ دنیائے ادب کی معروف شخصیات محترم ڈاکٹر محمد معز الدین اور محترمہ ڈاکٹر عالیہ امام نے اس تقریب کو رونق بخشی جبکہ محترم بریگیڈیئر اقبال شفیع چیئر مین سرسید میموریل سوسائٹی خصوصی طور پر تشریف لائے۔ اجلاس کی صدارت محترم سید منصور عاقل صدر الاقرباء فاؤنڈیشن نے کی پروگرام کی میزبانی کے فرائض جناب جلیس احمد صدیقی نے انجام دیئے۔

سید معز احمد تلاوت قرآن پاک کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے اس پروقار تقریب کا آغاز ہوا۔ سید معز احمد نے جو سیکریٹری جنرل سید نعیم احمد کے فرزند ہیں تلاوت قرآن پاک کی سعادت حاصل کی ازاں بعد جناب سید محمد حسن زیدی نے بحضور سرور کائنات ﷺ ایک خوبصورت ہدیہء نعت پیش کیا جسے حاضرین نے بہت پسند کیا اس کے بعد سیکریٹری جنرل جناب نعیم احمد نے فاؤنڈیشن کی سالانہ رپورٹ بابت سال ۲۰۰۳ء اور بجٹ پیش کرتے ہوئے سال بھر کی کارکردگی پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انہوں نے فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ترتیب دیئے گئے مختلف تفریحی علمی، ادبی اور قومی اہمیت کے حامل پروگراموں کا بھی جائزہ پیش کیا اور ساتھ ہی زکوٰۃ، سوشل ویلفیئر فنڈ اور دیگر فلاحی کاموں کا ذکر بھی
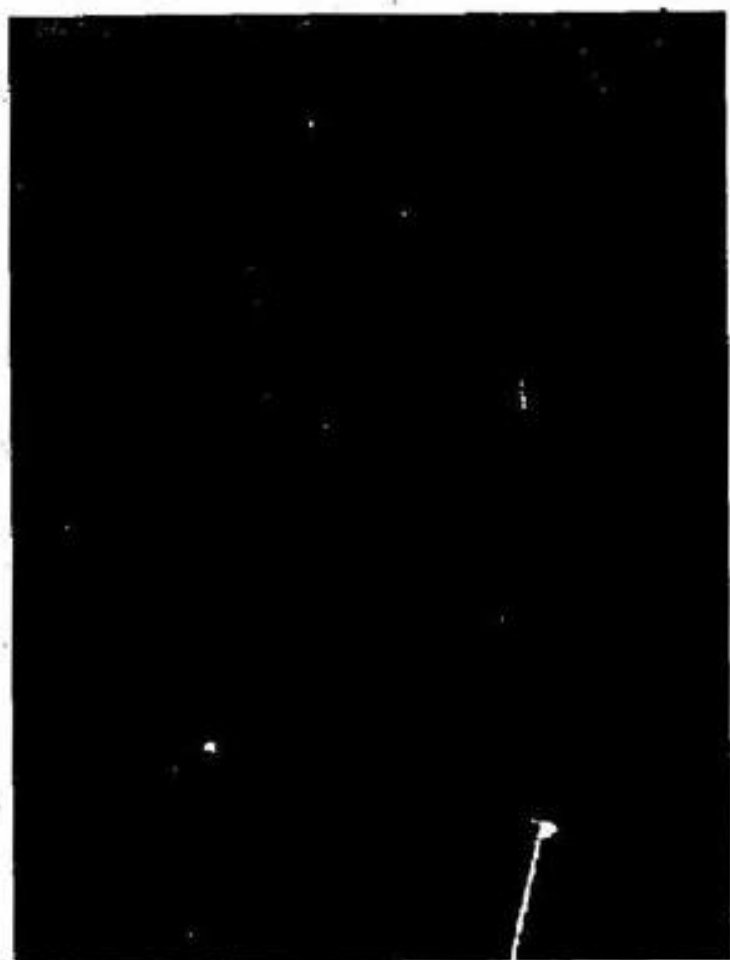
سید حسن زیدی نعت پیش کرتے ہوئے۔

کیا انھوں نے سہ ماہی الاقرباء کے حوالے سے بھی گفتگو کی اور اراکین کو بتایا کہ کس طرح یہ میگزین پوری آب وتاب سے باقاعدگی کے ساتھ نہ صرف شائع ہو رہا ہے بلکہ اس کا شمار ملک کے صف اول کے علمی و ادبی جرائد میں ہونے لگا ہے سالانہ رپورٹ کے اختتام پر جناب جلیس احمد صدیقی نے اراکین الاقرباء فاؤنڈیشن کو اس پر اظہار خیال کی دعوت عام دی۔ بعدازآں سالِ گذشتہ کے دوران خالی ہونے والی ایگزیکٹو کمیٹی کی ایک نشست پر انتخاب کا اعلان کیا جناب سید آفتاب احمد نے بحیثیت الیکشن کمشنر فرائض انجام دیئے۔ اس نشست کیلئے صرف ایک ہی نامزدگی موصول ہوئی تھی جس پر جناب سید محمد حسن زیدی بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ انھوں نے بعد میں اپنے مختصر خطاب میں اراکین کا شکریہ ادا کیا۔

صدر فاؤنڈیشن سیّد منصور عاقل مجلس عمومی کے ساتویں سالانہ اجلاس سے مخاطب ہیں۔

اس کے بعد جلیس صدیقی صاحب نے صدر الاقرباء فاؤنڈیشن محترم منصور عاقل کو خطاب کی دعوت دی صدر محترم نے تمام اراکین اور دیگر مہمانانِ گرامی کو خوش آمدید کہا۔ اس کے بعد آپ نے فاؤنڈیشن کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی اور آپ نے حسب سابق اس مرتبہ بھی پرزور انداز میں یہ فرمایا کہ کسی بھی رضاکارانہ تنظیم کو کامیابی سے چلانے اور زندہ جاوید رکھنے کیلئے عزم صمیم، جہد مسلسل اور جذبۂ صادق کی ضرورت ہوتی ہے' الاقرباء فاؤنڈیشن نہایت کامیابی سے اپنے نیک مقاصد کو پورا کررہی ہے۔ آپ نے فرمایا حقدار کو حق پہونچانا ہماری تنظیم کا مقصد ہے جس کو ہم نے اپنے عزیز و اقارب سے شروع کیا ہے کہ یہ فرمان الٰہی بھی ہے اس کار خیر کو انشاء اللہ ہم بہت جلد آگے اور بہت آگے لے جائیں گے آپ نے تنظیم کے اراکین کے پرخلوص تعاون مثبت رویئے اور جوش و جذبہ کا خاص طور پر ذکر کیا کہ جن کی اجتماعی کوششوں سے فاؤنڈیشن اپنے پرائے سب کی بلا امتیاز خدمت کررہی ہے آپ نے

اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ یہ تنظیم چندوں اور سرکاری امداد کی مرہون منت نہیں بلکہ کلیتہً اپنے وسائل، تائید ایزدی اور اراکین کی ذمہ دارانہ سوچ اور جذبہ کا نتیجہ ہے۔

جناب صدر نے خطاب کے دوران سہ ماہی الاقرباء کے حوالے سے بھی اظہار خیال کیا آپ نے حاضرین کو بتایا کہ یہ جریدہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے بہت کم مدت میں اس نے ملکی ادبی تاریخ میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کرلیا ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ یہ رسالہ ادارہ پر کسی طرح بوجھ نہیں۔ بلکہ خود پیدا کردہ وسائل ہی اسکی استقامت وترقی کے ضامن ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب یہ میگزین علمی وادبی خدمت کے علاوہ فاؤنڈیشن کے مالی وسائل میں اضافہ کا باعث بن کر اس کے فلاحی دائرہ کار کو وسیع تر کرنے میں مددگار ہوگا اسی دوران صدر محترم نے ان فلاحی کاموں کا بھی ذکر کیا جو الاقرباء فاؤنڈیشن اپنے محدود مالی وسائل کے باوجود وقتاً فوقتاً انجام دیتی رہتی ہے آخر میں آپ نے ان دعائیہ کلمات کے ساتھ کہ "اللہ ہمارے نیک جذبوں کو قائم ودائم رکھے" اپنی تقریر کا اختتام کرتے ہوئے تمام اراکین ومہمانان گرامی کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اس تقریب کو رونق بخشی۔

صدارتی خطاب کے اختتام کے ساتھ ہی اجلاس کی رسمی کارروائی اختتام پذیر ہوئی جناب جلیس صدیقی نے پروگرام کے دوسرے حصے کا اعلان کیا اور یہ تھا دلچسپ وخوبصورت ثقافتی پروگرام۔ ثقافتی پروگرام کا سنتے ہی تمام حاضرین کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے اس پروگرام کا سب سے پہلا آئٹم ننھے منے بچوں کے درمیان فینسی ڈریس شو کا مقابلہ تھا جس کی ترتیب محترمہ شبنم جلیس نے راقم الحروف کی معاونت سے کی تھی۔ اس

فینسی ڈریس شو میں شریک بچے

شو میں ۳ سے ۱۲ سال تک کے بچوں نے حصہ لیا یہ ننھے منے پھول تو ویسے ہی بڑے پیارے لگتے ہیں رنگ برنگے خوبصورت لباسوں میں ملبوس نت نئے گیٹ اپ میں جب یہ پھول ہنستے مسکراتے شرماتے لجاتے نیر سالاری اور عظمیٰ نعیم کی رہنمائی میں ہال میں داخل ہوئے تو حاضرین کے چہرے حیرت وخوشی سے کھل اٹھے سب نے بھرپور تالیوں سے ان کا استقبال کیا عظمیٰ باری باری ہر بچے کو اسٹیج پر لائن میں کھڑا کرتی رہیں ساتھ ہی راقم الحروف نے ان کے گیٹ اپ کے لحاظ سے ان کا تعارف ہلکے پھلکے انداز میں حاضرین کے سامنے پیش کیا۔ ہر بچہ اپنے گیٹ اپ کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا اور کسی طور پہچانا نہیں جا رہا تھا اس تمام سج دھج کے لئے بچوں کی مائیں بلاشبہ تعریف وتوصیف کی مستحق تھیں کہ جنھوں نے کردار کی تمام تر باریکیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے جگر گوشوں کو اس دلچسپ مقابلے کیلئے تیار کیا تھا انہوں نے اتنی مہارت سے ان کی نوک پلک درست کی تھی کہ جج صاحبان محترمہ ڈاکٹر عالیہ امام، بیگم شبنم جلیس اور بیگم طیبہ آفتاب کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ اول انعام کا حقدار کس کردار کو ٹھہرایا جائے۔ سب سے پہلے سیدہ شبیہ فاطمہ 'ماڈل' کے روپ میں خوبصورت لباس زیب تن کئے انگلی میں چابی گھماتی، اٹھلا اٹھلا کر چلتی، بے نیازانہ انداز میں اسٹیج پر آئیں تو بھرپور تالیوں نے ان کا استقبال کیا ان کے بعد عروسہ فاطمہ سر پر ٹوکری ہاتھ میں جھاڑو اٹھائے میلا سا شلوار قمیض پہنے 'ماسی' کے گیٹ اپ میں نمودار ہوئیں تو ہال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ اور پھر تشریف لائیں عیشاء فاطمہ۔۔۔ کشمیری لڑکی کے گیٹ اپ میں انہوں نے پیلے رنگ کا کشمیری لباس پہنا ہوا تھا سر پر گول خوبصورت ٹوپی تھی اور اس پر چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کا گٹھا۔۔۔ بڑا ہی خوبصورت تھا ان کا کردار بھی اور پھر آئے معتصم شاہنواز انہوں نے سب کو حیرت زدہ ہی کر دیا۔ قاری صاحب کے روایتی لباس (گول ٹوپی، سفید کرتا، ٹخنے سے اونچی شلوار اور پرنٹڈ واسکٹ)

سیدہ اریبہ تمکینذ نے فینسی ڈریس شو میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔

میں وہ سچ مچ قاری صاحب لگ رہے تھے اس پر گھنی کالی ڈاڑھی نوک دار لمبی مونچھیں سب ہی کچھ تو تھا ان کے پاس سب کو متاثر کرنے کیلئے۔۔۔ان کا استقبال بھی بڑا والہانہ تھا۔ان کے بعد منصب عزیز ''حاجی صاحب'' کا روپ دھارے اسٹیج پر آئے۔۔۔صاف شفاف دودھ جیسے سفید احرام میں لپٹے ہاتھ میں تسبیح اور کندھے پر بیلٹ کے ساتھ لٹکا بڑا سا پرس جس میں غالباً ضروری کاغذات و کرنسی نوٹ تھے اور تسبیح کے دانوں پر چلتی انگلیاں۔۔۔بتا رہی تھیں کہ وہ ابھی ابھی حج فلائٹ سے اترے ہیں۔ان کیلئے بھی زور دار تالیاں بجیں۔۔۔اور پھر بہت ساری تالیوں کی گونج میں سامنے سے نمودار ہوئے۔پولیس انسپکٹر، زمان جان اطہر۔۔۔ان کی تو آن بان ہی نرالی تھی۔سر پر نیوی بلیو کیپ۔بائیں جانب تھوڑی ڈھلکی ہوئی سامنے کی جانب سلور پھول لگا ہوا۔ان پر بڑی جچ رہی تھی اسکائی بلو قمیض کے دونوں شانوں کے اوپر سلور رنگ کے تین تین پھول سامنے بائیں جانب جیب پر زمان جان اطہر کا بیج اور اس کے نیچے پولیس بیج قمیض کے سامنے کی طرف دائیں جانب سلور رنگ میں چڑیا کی شکل کا پولیس مونوگرام چسپاں تھا جبکہ دونوں آستینوں پر کندھوں سے نیچے انسپکٹر پولیس کے ترنگے کمانڈو بیج لگے ہوئے ان کی شخصیت کو نکھار رہے تھے نیوی بلو پینٹ پر نیوی بلو چوڑی سی بیلٹ بڑے سے سلور پولس مونوگرام کے ساتھ کردار میں حقیقی رنگ بھر رہی تھی۔بیلٹ میں ایک طرف پستول ہک تھا اور دوسرا پستول انہوں نے خالص پولیس والے اسٹائل سے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا گھنی کالی مونچھوں اور تجسس بھری پوری کھلی آنکھوں نے ان کے چہرے کو سنجیدہ اور رعب دار بنا دیا تھا خاص پولیس والوں کے انداز میں نپے تلے قدموں کے ساتھ جب وہ اسٹیج پر آئے تو تمام حاضرین نے پر زور تالیاں بجا کر ان کا استقبال کیا۔اور اب آپ کی ملاقات کرواتے ہیں پیاری سی موٹی سی اریبہ تلمیذ سے۔

زمان جان اطہر پولیس انسپکٹر کے لباس میں (خصوصی انعام)

''پنجابن لڑکی'' کے گیٹ اپ میں تو وہ اور بھی خوبصورت ہوگئی تھیں۔لال رنگ کی پنجابی انداز میں

سیدہ تزئین منصور قصائی کے لباس میں (خصوصی انعام)

پہنی دھوتی اس پر پیلے رنگ کا گوٹہ سے سجا کرتا۔ سر پر بڑا سا لال دوپٹہ جسے خوب پھیلا کر اوڑھا ہوا تھا۔ کانوں میں بڑے بڑے بندے اور گلے میں ہار نے ان کو کچھ اور بھی حسین بنادیا تھا۔ کمر پر مٹی کی نفشین مٹکی دونوں ہاتھوں کی مدد سے خالص پنجاب کی گوری کے انداز میں ٹکائے جب وہ لجاتی، شرماتی اور مسکراتی اسٹیج پر آئیں تو ہال میں تالیوں کی آواز گونج اٹھی۔۔۔اور اسی لمحے ایک ننھا منا سا قصائی ہاتھ میں ٹوکا لہراتا اسٹیج کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ سب کی توجہ اس طرف مبذول ہوگئی۔ ننھے قصائی نے سر پہ کالا سفید پرنٹڈ رومال ڈالا ہوا تھا جو ایک طرف سے کندھے تک پھیلا ہوا تھا۔ اونچی سی دھوتی پر آدھی آستین کا سفید کرتا اور اس پر کالی، براؤن اور سفید چیک کی لمبی سی ڈھیلی ڈھالی واسکٹ ہاتھ میں تیز دھار ٹوکا۔۔۔آنکھوں میں سرمہ گال پر بڑا سا تل اور ہونٹوں کے اوپر باریک سی خوبصورت مونچھیں بڑا ہی خوبصورت قصائی تھا خوشی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ جی ہاں آج اسے بہت سارے بکرے جو ذبح کرنے تھے۔ منہ ہی منہ میں "ٹوٹے ٹوٹے کردوں گا۔" کے الفاظ بڑبڑاتے اور خیالی بکرے پہ ٹوکے کے وار کرتے۔ لہراتے ہوئے جب قصائی میاں اسٹیج پر پہونچے تو حاضرین نے تالیاں اور بہت ساری تالیاں بجا کر ان کو داد دی۔۔۔اور۔۔۔جناب یہ ننھا قصائی دراصل تو ہماری چھوٹی سی پیاری سی تزئین منصور تھی۔۔۔آخر نہیں پہچان سکے نا آپ اسے۔۔۔!!

اور اب باری تھی معزالحق کی کمانڈو کا ڈریس ان پر خوب سج رہا تھا۔ گرین کیپ پر ایک طرف کمانڈو مونوگرام براؤن جیکٹ کی آستین پر لال ہرا پیلا اور سفید دائرہ کی شکل کا بیج۔۔۔اور گرین پینٹ ہاتھ میں گن۔ پاؤں میں فوجی بوٹ اور واقعی کمانڈو لگ رہے تھے۔ انہیں بھی بہت پسند کیا سب نے۔۔۔اور پھر خراماں خراماں چلتی ہوئی آئیں ملکہء عالیہ۔۔۔اس روپ میں تھیں سنبل حسن۔۔۔بے بی پنک کلر کی خوبصورت فرل والی فراک پنک کلر کا ہی چوڑی دار پجامہ سفید موزوں کے ساتھ پنک گرگابی شوز کانوں میں ٹاپس سر پر

پیارا سا ہیٹ۔ کمر کے گرد نازک سی بیلٹ۔ گلے میں موتیوں کے ہار نازک سراپا پر ہر چیز ہی جچ رہی تھی۔ پھر کون تھا جو حسین و جمیل ملکہ کے روپ میں انہیں پسند نہ کرتا۔!!

کھل کر داد دی سب نے ان کو۔۔۔ ملکہ کے بعد فائز حسن تشریف لائے۔ وہ اسکیمو کے گیٹ اپ میں تھے۔ انہوں نے اسی مناسبت سے لباس پہنا ہوا تھا۔ اور کافی پرکشش لگ رہے تھے۔۔۔ اور پھر سامنے سے حمزہ فرحان بیٹ مین کے گیٹ اپ میں اسٹیج کی طرف بڑھتے نظر آئے۔ انہوں نے گرے جرسی گرے پینٹ اور گرے جوگرز پہنے ہوئے تھے منہ پر بیٹ ماسک پہنا تھا۔ جبکہ جرسی کے سامنے کی طرف بڑی سی چمگادڑ کا مونوگرام چسپاں تھا۔ ان کو بھی اس کردار میں سب نے سراہا۔۔۔ بیٹ مین کے بعد رافع فرحان ہال میں داخل ہوئے۔ یہ بز گلائیڈر کے روپ میں تھے انہوں نے جینز کی شرٹ اور پینٹ پہنی تھی جس کا رنگ سکائی

آنسہ زرین ظفر موم بتیاں جلانے کے مقابلے میں جناب ڈاکٹر محمد معز الدین سے اول انعام حاصل کر رہی ہیں۔

بلیو تھا۔ اس پر انہوں نے آسمانی ہرے اور لال رنگ کا گلائیڈر پہنا ہوا تھا۔ جس کے دونوں طرف نکلے ہوئے لمبے پر ایسا تاثر دے رہے تھے کہ جیسے وہ ابھی ابھی پرواز کرنے والے ہیں۔ انہوں نے بھی حاضرین کو خاصا متاثر کیا۔ اور سب سے آخر میں تشریف لائیں' بی مالن' ۔۔۔ یہ روپ ضحیٰ نے دھارا تھا۔ پیلے رنگ کے فراک اور گولڈن چمکدار تنگ پجامہ گلے میں زرد پھولوں کے ہار۔۔۔ ہاتھوں میں گجرے سجے ان کے سراپا کو حسین بنا رہے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں پھولوں سے بھری نازک سی ٹوکری تھی۔ جس میں سے وہ حاضرین پہ پھولوں کی پتیاں نچھاور کرتی بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔ ان کے گیٹ اپ کو بھی سب نے بہت پسند کیا۔ مالن کے ساتھ ہی فینسی ڈریس شو کا مرحلہ اختتام کو پہنچا۔۔۔ لیکن ابھی ایک مشکل مرحلہ باقی تھا اور وہ تھا تقسیم انعامات۔۔۔

اس شو کے تمام کے تمام پھول اتنے حسین و خوش رنگ تھے کہ کسی کو کسی پر فوقیت دینا مشکل نظر آ رہا تھا۔ لیکن کسی نہ کسی کو اول تو آنا ہی تھا۔ کافی دیر صلاح مشورے اور سوچ بچار کے بعد محترمہ ڈاکٹر عالیہ امام نے بیگم شبنم

جلیس صاحبہ اور محترمہ بیگم طیبہ آفتاب ۔ سے مشورہ کے بعد اریبہ تکمیذ کو جو کہ پنجابن کے روپ میں تھیں اول انعام کا مستحق قرار دیا سب نے پُر زور تالیوں سے اس فیصلے کی تائید کی۔ ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ شو کے تمام بچوں کو ٹوکن انعام سے نوازا جائے کہ انہوں نے اجتماعی طور پر اس پروگرام کو رنگین و خوبصورت بنایا تھا۔

پروگرام کے اختتام پر محترمہ شبنم جلیس صاحبہ نے پولیس انسپکٹر اور قصائی کیلئے اپنی جانب سے خصوصی انعامات دینے کا اعلان کیا۔۔اور یہ انعامات آپ نے مجلس انتظامیہ کی ماہانہ میٹنگ میں دونوں بچوں کو دیئے۔

مجلس انتظامیہ ہمیشہ اس امر کو مدنظر رکھتی ہے کہ سالانہ اجلاس کے موقع پر ثقافتی پروگرام میں ایسے آئٹم رکھے جائیں جن میں بچے بڑے اور بزرگ سب حصہ لے سکیں۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی ایسے پروگرام شامل کیے گئے تھے جو سب کیلئے یکساں دلچسپی اور کشش رکھتے تھے۔ پرگرام کا اگلا آئٹم خواتین کے درمیان موم بتی جلانے کا تھا اس مقابلے میں جو خاتون ماچس کی ایک تیلی سے سب سے زیادہ موم بتیاں جلائیں گی۔اول انعام کی مستحق ہوں گی۔ عائشہ فرحان نے ایک گول تھالی میں ایک درجن کے قریب موم بتیاں سجا کر میز کے سنٹر میں رکھ دیں۔اس مقابلے میں حامدہ وقار صاحبہ، ہما سالاری صاحبہ زرین ظفر، مسز شاہنواز اور مسز منور نے حصہ لیا۔حاضرین میں بڑا جوش وخروش پایا جاتا تھا۔سب تالیاں بجا بجا کر ہر ایک کو حوصلہ دینے کی کوشش کررہے تھے اس مقابلے میں مس زرین ظفر آٹھ موم بتیاں جلا کر اول رہیں۔اس سلسلہ کا اگلا مرحلہ دلچسپ کوئز مقابلہ تھا۔جس میں اجلاس کے تمام شرکاء کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔اس مقابلہ کی کمپئرنگ عمران
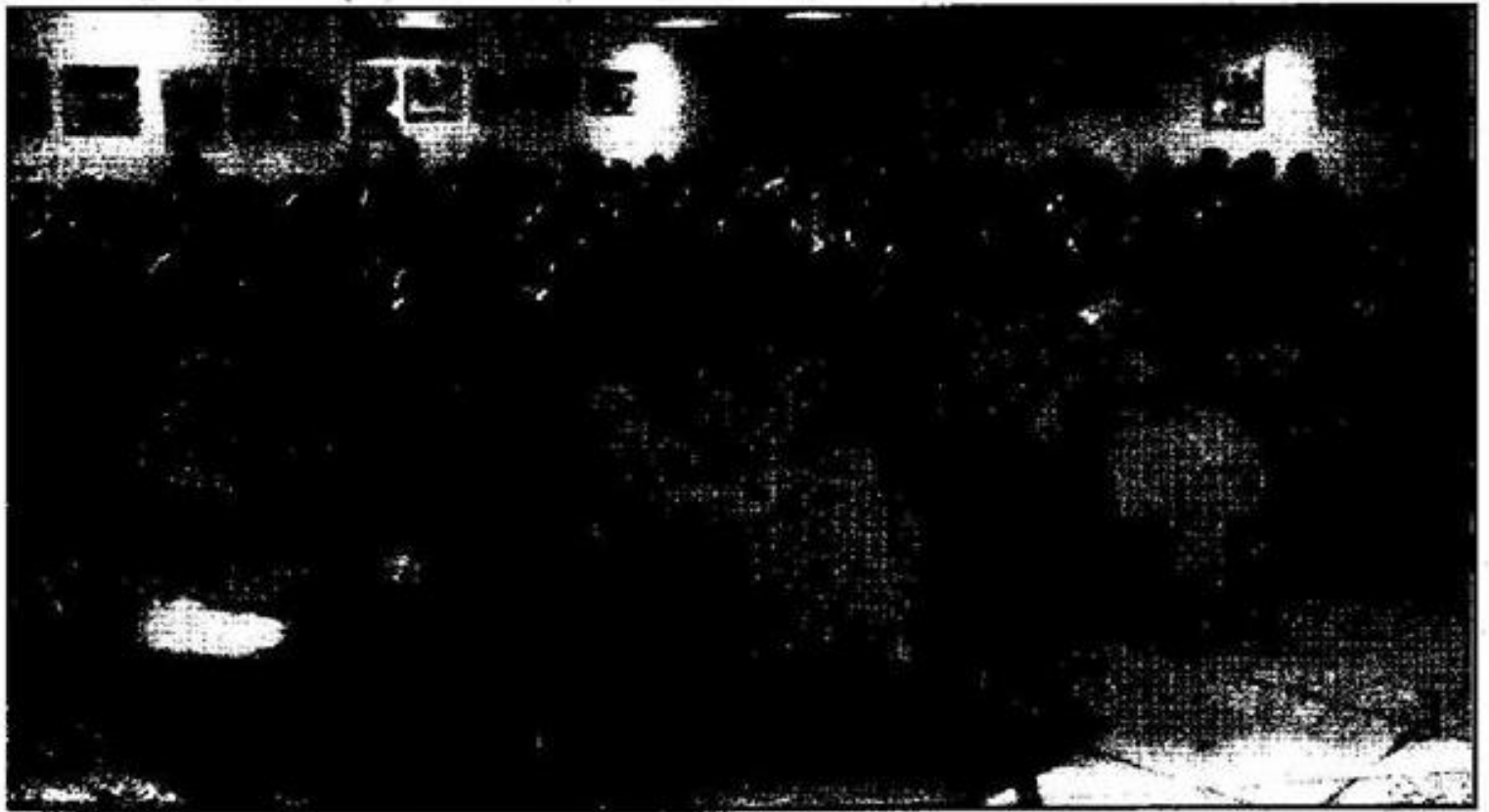
مجلس عمومی کے ساتویں سالانہ اجلاس کے شرکاء کا ایک منظر

عمران احمد صدیقی کوئز مقابلہ کے کمپیئر

احمد صدیقی نے بڑی خوبصورتی اور اعتماد سے کی زیادہ تر سوالات ہمارے پیارے وطن پاکستان سے متعلق تھے جن کا انتخاب بھی عمران احمد ہی نے کیا تھا عمران جناب جلیس احمد صدیقی رکن مجلس انتظامیہ کے صاحبزادے ہیں اس پروگرام میں اجلاس کے تمام شرکاء نے بڑے جوش وخروش کا مظاہرکیا۔ابھی سوال ختم ہی ہوتا تھا کہ چاروں طرف سے ہاتھ کھڑے ہونے کے ساتھ زور دار آوازیں بھی آنے لگتیں۔ بچے تو اپنی سیٹوں سے باہر نکل نکل کر سب سے پہلے جواب دینے کی کوشش میں زور زور سے آوازیں نکال رہے تھے تھوی دیر کیلئے پورے ہال میں افراتفری سی مچ گئی۔ آخر کار جلیس صاحب کو شرکاء سے اپنی اپنی سیٹ پر تشریف رکھتے ہوئے جواب دینے کی درخواست کرنا پڑی۔۔۔اور یوں یہ مرحلہ بھی تمام ہوا اس مقابلے میں مہرین انیس، فائزحسن، نیر سالاری، اسد، سبل حسن، مدثر سالاری، عفیفہ منیر ،مسز بشارت، مسز حامدہ وقار اور تزئین طاہر نے انعامات حاصل کیئے۔ ایک اور دلچسپ مرحلے کی اور یہ تھا ''مزاج شناسی'' جس کی کمپئرنگ کیلئے جناب جلیس احمد صدیقی نے محترمی فہیم احمد گردیزی کو دعوت دی۔ جناب فہیم گردیزی اسٹیج پر تشریف لائے اور اس مرحلہ میں جناب حسن سجاد اور بیگم حسن سجاد صاحبہ کو شرکت کی دعوت دیتے ہوئے اسٹیج پر تشریف لانے کو کہا پروگرام کا آغاز گردیزی صاحب نے ایک خوبصورت شعر سے کیا۔اور اپنی ظریفانہ طبیعت کا مظاہر کرتے ہوئے دو تین چٹکلے سنائے جن کو تمام حاضرین نے بڑا انجوائے کیا اس کے بعد آپ نے جناب حسن سجاد کو ہال سے باہر بھیج کر ان کی بیگم صاحبہ سے سوالات کا سلسلہ شروع کیا تمام حاضرین نہایت دلچسپی اور انہماک سے سوال وجواب کا یہ سلسلہ دیکھ رہے تھے۔بیگم صاحبہ سے سوالات کا سلسلہ ختم ہوا تو آپ نے جناب حسن سجاد کو اندر بلالیا۔اور وہی سوالات ان سے کیئے۔۔۔زیادہ تر کے جوابات ایک سے یا پھر ملتے جلتے تھے جو دونوں جیون ساتھیوں کی ذہنی ہم آہنگی اور مزاج شناسی کو ظاہر کرتے تھے۔

آخر میں اس جوڑے کو محترمہ ڈاکٹر عالیہ امام نے فاؤنڈیشن کی جانب سے انعام دیا۔مجلس عمومی کے

سیدفہیم احمد گردیزی پروگرام ''مزاج شناسی'' کے کمپیئر
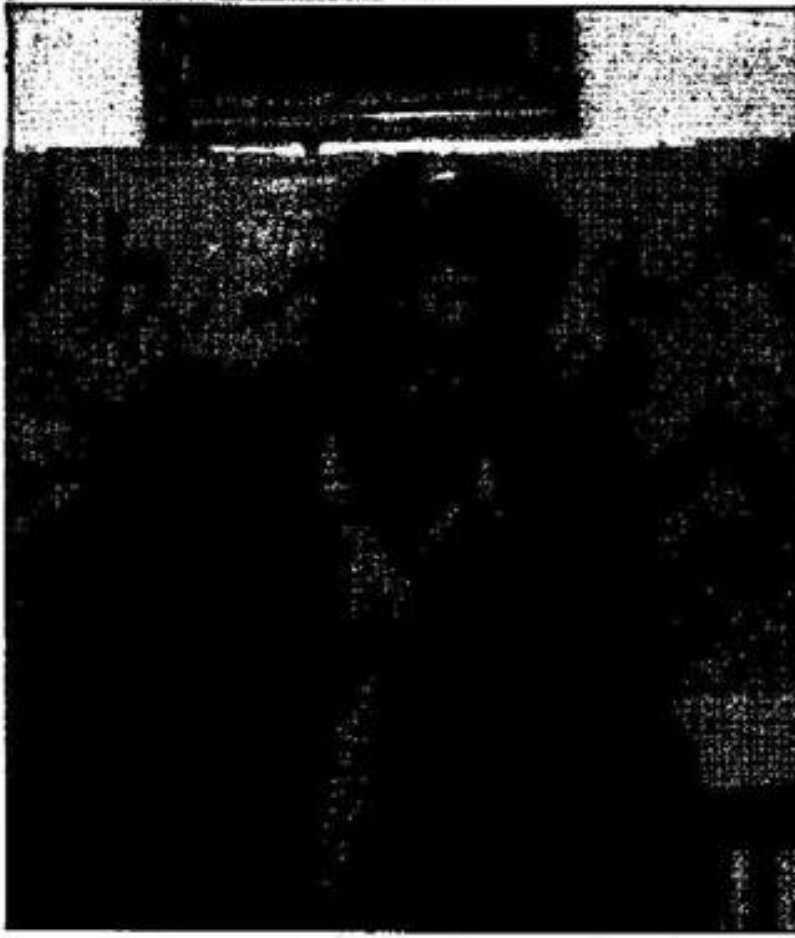
اجلاس کے موقع پر ہر سال ایسے تمام طلباء اور طالبات کو جو تعلیمی شعبہ میں غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں تعلیمی اسناد اور شیلڈ دی جاتی ہیں تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو سکے اور اس کا اہتمام رکن مجلس انتظامیہ محترم سید آفتاب احمد و بیگم طیبہ آفتاب کرتے ہیں۔ اس سال سے اس حوالے سے ایک نیا سلسلہ Student of the year کے زیر عنوان شروع کیا گیا۔ جس کا اہتمام سہ ماہی الاقرباء کی طرف سے کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن محترم سید آفتاب احمد کی اہلیہ محترمہ طیبہ آفتاب نے یہ شیلڈ بھی اپنی طرف سے دینے کا اعلان کیا۔ تعلیمی نظام کی وسعت کے پیش نظر کسی ایک طالب علم کو شیلڈ کا مستحق قرار دینا مشکل ہے کہ ہر شعبہ میں ہر ایک کی کارکردگی مختلف ہونے کی بناء پر ایک شیلڈ نہیں دی جاسکتی چنانچہ ہر مستحق طالب علم کو الگ الگ شیلڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا یہ تمام شیلڈز جناب سید آفتاب احمد نے اپنی نگرانی میں تیار کرائیں ان کا ڈیزائن بہت خوبصورت ہے۔ پہلی شیلڈ آنسہ عامرہ صدیقی کو جو محمد علی صدیقی کی صاحبزادی ہیں دی گئی۔ انہوں نے Higher Secondery School کے فائنل امتحان میں ۸۳۰ نمبر حاصل کئے اور A گریڈ میں

جناب و بیگم حسن سجاد محترمہ ڈاکٹر عالیہ امام سے ''مزاج شناسی'' پروگرام میں کامیابی کا انعام وصول کرتے ہوئے۔

کامیاب ہوئیں۔ دوسری شیلڈ مجاہد حسین نے جو جناب حسن سجاد کے صاحبزادے ہیں حاصل کی انہوں نے
BCS میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ تیسری شیلڈ صبا صدیقی نے حاصل کی یہ جناب جلیس احمد صدیقی کی
صاحبزادی ہیں نے BBA Honours میں ۸۹ء۳ CGPA کے ساتھ بحریہ یونیورسٹی سے نمایاں کامیابی
حاصل کی۔ چوتھی شیلڈ کی حقدار ہالہ صابرہ جو جناب اے کے صابری کی صاحبزادی ہیں قرار پائیں۔ جو
کہ 'O' لیول میں 5 As حاصل کر کے سرفہرست رہیں اور کیمرج میں بھی بہترین کارکردگی کا اعزاز حاصل کیا
تعلیمی شعبہ میں بہترین کارکردگی کے اعتراف میں انہیں Student of the year کے اعزاز سے بھی نوازا
گیا۔ ثقافتی پروگرام کا آخری مرحلہ تھا "لکی ڈرا" سید نعیم احمد سیکریٹری جنرل لکی ڈرا کیلئے لال رنگ کی ٹماٹرنما
ٹوکری جس میں انہوں نے انٹری ٹکٹ کے دوسرے تمام حصے ڈال رکھے تھے لے کر جناب ممتاز اللہ سالاری
نائب صدر کی طرف گئے اور اس میں سے ایک پرچی نکالنے کی درخواست کی پہلی پرچی خالی گئی۔ دوسری پرچی
پر خرم شہزاد کا نمبر نکلا۔ ایک اور پرچی زمان جان اطہر سے نکلوائی جس پر محمد علی صدیقی نے انعام جیتا اس مرحلے
میں بھی تمام حاضرین نے نہایت دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور جیتنے والے حضرات کو تالیاں بجا کر مبارکباد دی۔ لکی ڈرا
کے بعد یہ خوبصورت تقریب اختتام کو پہنچی جلیس صدیقی صاحب نے تمام شرکائے تقریب ممبران اور مہمانان
گرامی کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی پرجوش شرکت نے اس کو کامیاب بنایا۔ آخر میں عشائیہ سے تواضع کی گئی۔
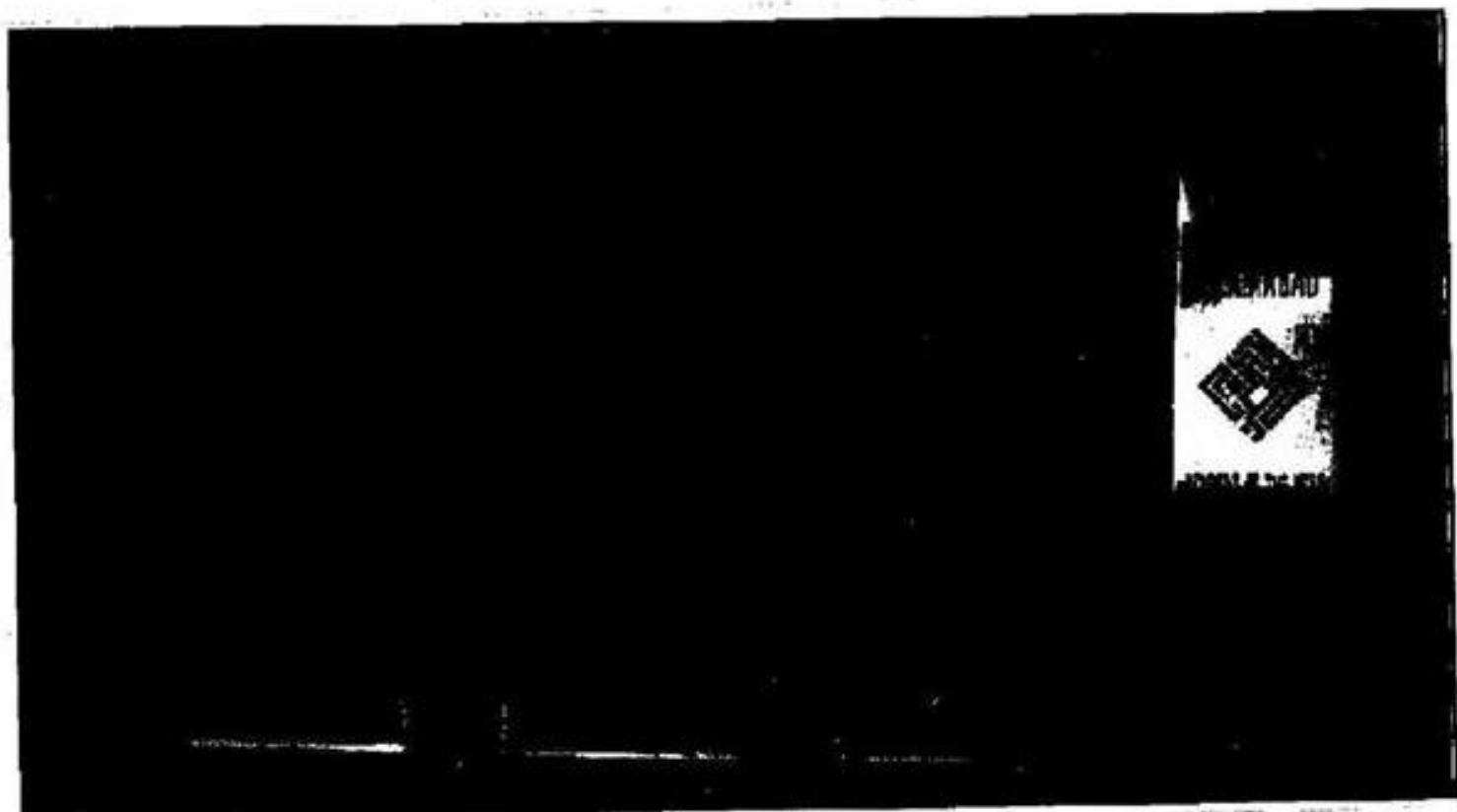
تعلیمی شعبہ میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے طلباء و طالبات کی شیلڈز، ہالہ صابری (سٹوڈنٹ آف دی ایئر)،
عامرہ صدیقی (ہائرسیکنڈری سکول شیلڈ)، مجاہد حسین (بی سی ایس شیلڈ)، صبا صدیقی (بی بی اے آنرز شیلڈ)

کیپٹن ڈاکٹر مختار احمد

سیّد انتظام الدین حیرت

اسلام آباد کی دل نشین و دلربا وادی میں جس کو پاکستان کا دارالحکومت ہونے کا شرف حاصل ہے اہل ذوق حضرات اکثر شعروسخن کی محفلیں منعقد کرتے رہتے ہیں۔ ماضی میں ایک محترم بزرگ جن کو غزل و نظم اور دیگر اصناف سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی بزم جام کے صدر تھے۔ آپ جب محفل میں تشریف لاتے تو احتراماً شعرائے کرام دیدہ و دل فرش راہ کرتے اور ان کا کلام نہایت ذوق وشوق سے سنتے۔ ان کا اخلاق اور بلندی کردار ہرایک کو اپنا گرویدہ کر لیتا تھا۔ ان کے اشعار میں روانی، گہرائی، گیرائی، جذبات اور ندرت خیال کے علاوہ فنی پختگی اور قادرالکلامی ایسے اوصاف تھے جو ان کی ہر دل عزیزی اور محبت میں اضافہ کا باعث بنتے تھے۔ میں اور موج نگینوی صاحب محض جام صاحب کا کلام سننے کیلئے اسلام آباد جاتے اور اپنے دامن کو گل ہائے نوشگفتہ اور دُرہائے نایاب سے مالا مال کرتے۔ ایک دن ایک اور بزرگ صورت بھاری بھرکم شخصیت تشریف لائے۔ ہاتھ میں عصائے پیری تھا۔ دل آویز ریش اور غالب کی طرح لمبی ٹوپی دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ کسی مدرسے کے ماسٹر غلطی سے بزم سخن کو مسجد یا مدرسہ سمجھ کر تشریف لے آئے ہیں۔ وہ آکر حضرت جام بدایونی کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ چند شعرا کے بعد حیرتؔ صاحب کا نام پکارا گیا تو پتہ چلا کہ آپ شاعر ہیں۔ آپ نے آنکھوں پر عینک لگائی اور نغمہ سرا ہوئے۔

منحصر ہے بے قراری پر قرار زندگی — ختم ہو جائیگا ورنہ کاروبار زندگی

منحصر ہے چند سانسوں پر شمار زندگی — لٹ سکے تو لوٹ لو اب بھی بہار زندگی

مطلع اور حسن مطلع سننے کے بعد محفل پر سناٹا چھا گیا۔ میں حیرت میں ڈوب کر رہ گیا کہ ایک مولوی نما بزرگ اس قدر صاحب ذوق بھی ہو سکتے ہیں اور ان کا ذوق شعری اس قدر پختہ۔ عمیق اور طرز بیاں اس قدر دل گداز و پرتاثیر بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی آئینہ حیرت بن کر رہ جائے۔ جذبات جب الفاظ کا خوبصورت جامہ پہن کر طلسم نظر فریب اور رنگ جلوہ کا پیکر حسین بن جائیں تو بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ سادگی اس پر

☆ آپ محترم سید انیس الدین احمد اور محترمہ پروین (اراکین الاقرباء فاؤنڈیشن) کے والد گرامی تھے

پُر لطف زبان و بیاں کی چاشنی تیر وسناں کی صورت میں دل میں اتر جاتی ہے۔ یہی غزل کی خوبی ہے کہ سننے والا بے اختیار اک نامعلوم کیفیت میں کھو کر رہ جائے۔ ہم ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ آپ نے دوسرا وار کیا

اور بڑھتی جا رہی ہیں دل کی یہ بے تابیاں   اور اٹھتا جا رہا ہے اعتبار زندگی

پھر تو بس ان کی خوشی پر ہی ہے میری مرگ و زیست   میں جب ان کو دے چکا کل اختیار زندگی

مجھے محسوس ہوا کہ ایک نابغہ روزگار ہستی اپنے فنی عروج اور پختہ کاری کا مظاہرہ کر رہی ہے اور دیدہ وروں کے دل و دماغ کو اپنے قبضہ اقتدار میں لانے کیلئے بے تاب ہے۔ میں جذبات کی نزاکت ندرت فکر، زباں و بیاں کی حلاوت اور اظہار خیال پر قدرت و گرفت کو دیکھ کر حیراں رہ گیا کہ غزل کے پیرائے میں محبت کے معاملات اور واردات قلب کو کس اختصار اور قادرالکلامی کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

میری نگہ میں اردو کے قادرالکلام اور زباں و بیاں کے صاحب طرز سخنور مصحفی ذوق اور داغ کی صورتیں رقص کر رہی تھیں اور میں ماضی کے عمیق سمندر میں غوطہ زن تھا۔ یہ تھی سیّد انتظام الدین حیرت سے میری پہلی ملاقات جو میرے ذہن پر مرقوم ہو کر رہ گئی اور ان کے کلام کی لذت اور حلاوت مجھے مجبور کرتی رہی کہ میں ان کے کلام کو بار بار سنوں اور بحر حیرت میں ڈوب جاؤں۔

میرے تجسس اور ذوق و شوق نے سمند فکر پر تازیانے کا کام کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ آپ کا نام سیّد انتظام الدین اور حیرت تخلص ہے۔ ساری زندگی ریلوے میں بطور گارڈ گزارنے کے بعد اب ریٹائر ہو چکے تھے اور ڈی اے وی کالج کے سامنے گلی میں، ہائش پذیر تھے۔ ان کی عزلت گزینی اور خانہ نشینی ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ میں ان کی تلاش میں دوسرے دن ان کے گھر پر پہنچا اور لوگوں سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ حیرت صاحب کہاں ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے گھر والے بھی اور اہل محلہ بھی حیرت میں ڈوب کر رہ گئے اور کہنے لگے کہ یہاں حیرت نام کا کوئی فرد موجود نہیں ہے۔ اس بیان پر مجھے حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ جس شخص کی شہرت کا یہ عالم ہو کہ اس کے گھر والے بھی اس سے واقف نہ ہوں۔ اہل محلہ اور دوست احباب بھی بیگانہ ہوں اور کسی کو یہ علم نہ ہو کہ وہ شاعر بھی ہے تو حیرت نہ ہو گی تو کیا ہو گا۔ مجھے شاعر کی حرماں نصیبی اور سوختہ سامانی پر رونا آیا اور اپنا ہی ایک شعر دماغ میں گونجنے لگا۔

میں گریزاں ہی رہا ہر دم نمود و نام سے   میں نے کاٹی زندگی مختار گم نامی کے ساتھ

آپ یقین کریں کہ لوگ عزیز و اقارب۔ اہل کوچہ انتظام الدین کو تو جانتے ہیں لیکن حیرت سے

بالکل ناواقف ان کے بیوی بچوں کو بھی حیرتؔ سے کوئی سروکار نہیں۔

حیرت کو کوئی جانتا پہچانتا نہیں حیرت انہیں بھی ہوتی ہے حیرت کو دیکھ کر

میری خواہش تھی کہ ہماری اس دریافت کو لوگ قریب سے دیکھیں اس درِ نایاب کو جانیں اور پہچانیں۔

مقصود تھا کہ جان لے ہر صاحبِ نظر ایک شاعرِ عظیم ہے حیرتؔ کہیں جسے

سیّد انتظام الدین حیرتؔ قصبہ گلاؤٹھی میں جو ضلع بلند شہر میں سادات کی ایک مشہور بستی ہے پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اپنے علم اور دین داری میں لاجواب تھے۔ دور دور تک لوگ آپ کو سرچشمہ فیض سمجھ کر فیض یاب ہوتے تھے۔ اس علمی خاندان میں پیدائش کے باوجود آپ کو ہاکی فٹ بال اور کرکٹ سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ چنانچہ جب آپ کے والد گرامی قدر نے آپ کی مزید تربیت کرنا چاہی تو آپ کو علم وفضل کے بحرِ بے کنار علی گڑھ میں جانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور آپ نے تعلیم کی منازل علی گڑھ اور میرٹھ میں طے کیں۔ بعد میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد کھیلوں میں نامور ہونے کی بنا پر آپ کو بطور گارڈ ریلوے میں بھرتی کرلیا گیا۔ جب بھی آپ ہاکی اور کرکٹ کے میچ ٹی وی پر دیکھتے تو اپنے دورِ ماضی میں ڈوب کر رہ جاتے۔

لکھنو سے اگر شاہراہ اعظم پر سفر کیا جائے۔ تو کانپور اور علی گڑھ سے آگے ضلع بلند شہر شروع ہو جاتا ہے۔ بلند شہر سے ایک سڑک دہلی کی طرف چلی جاتی ہے اور دو سری سادات کے مشہور قصبہ گلاؤٹھی سے ہاپوڑ اور میرٹھ کی طرف جانکلتی ہے ہاپوڑ نہ صرف ایک مشہور منڈی ہے جہاں اجناس کا کاروبار ہوتا ہے بلکہ وہاں کے پاپڑ پورے برصغیر میں مشہور ہیں۔ قصبہ گلاؤٹھی میں مغلیہ دور میں سادات کو خاص طور پر آباد کیا گیا اور انہیں حکومت کی طرف سے نظم ونسق قائم کرنے کے اختیارات بھی تفویض کیے گئے۔ وہاں ان کی رہائش کیلئے ایک تاریخی قلعہ نما محل عالم وجود میں آیا۔ جس میں حیرتؔ صاحب کے اسلاف مقیم تھے۔ اس محل میں رہنے والے گو اپنی مغل دور کی آن۔ بان۔ اور شان کے حامل نہیں لیکن وہ اس محل میں حاکم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک رئیس کی صورت میں رہتے تھے۔ یہ محل اپنی گزشتہ روایات اور شوکت کا اب بھی امین اور آئینہ دار ہے۔ دور دور سے سیاح اور تاریخ سے شغف رکھنے والے لوگ اسے اب بھی دیکھنے کیلئے آتے تھے۔ انہیں میں مولانا حالی کا بھی شمار ہوتا ہے جو اس نادر الوقت تعمیر کو دیکھنے گئے۔ اور اس کا ذکر اپنے مجموعہ کلام دیوان حالی میں کیا۔ اس بلڈنگ میں حیرتؔ صاحب کی ولادت ہوئی اور وہیں شباب رفتہ کی یادیں مدفون ہیں۔ تقسیم ملک پر حیرتؔ صاحب تو

مہاجر بن کر دریائے خون سے گزر کر پاکستان میں آگئے لیکن ان کی فیملی نے اپنی تاریخی یادگاروں کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ وہ آج بھی اسی محل میں مقیم ہیں۔ ظاہر ہے کہ حیرتؔ نے گردش لیل ونہار کی تلخیوں کو گوارا کرنے کے لئے ہی اپنے وطن کو خیر باد کہا تھا۔ پاکستان کے ساتھ محبت ان کے رگ وپے میں موجزن تھی جس کے لئے انہوں نے اتنی بڑی قربانی بہ رضا و رغبت دی۔ اسلام اور وطن عزیز سے محبت ہی زندگی کا سرمایہ تھا۔ وہ اپنی قربانی پر مسرور تھے۔ حضرت غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

جان دی۔ دی ہوئی اسی کی تھی　　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آپ کو شروع سے ہی شعر وشاعری کا شوق بے پناہ تھا۔ چنانچہ اس جذبے کی تشکیل وتکمیل کے لئے آپ نے حضرت سیدّ امیر حسن امیرؔ گلاوٹھوی کی بارگاہ ادب نواز میں زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ امیرؔ کو زبان وبیان پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ وہ زبان کی حلاوتوں اور لطافتوں کو فنی پختگی کے سانچے میں مزین کر کے شعر کہتے تھے اور سننے والوں پر وجد کا عالم طاری کر دیتے تھے۔ ان کی توجہ وتربیت سے یہ درشہوار بھی اپنی پوری کامیابیوں کے ساتھ مطلع شاعری پر طلوع ہوا۔ اور اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہوتا چلا گیا۔ اس زمانے میں مضطرؔ گلاوٹھوی۔ فداؔ گلاوٹھوی اور ناطقؔ گلاوٹھوی کا طوطی بولتا تھا اور وہاں کی رونقیں ان حضرات کے دم سے قائم تھیں۔

علامہ قابلؔ گلاوٹھوی کا شمار بھی استادان فن میں ہوتا ہے۔ یہ بھی ہجرت کر کے کراچی آگئے تھے۔ قابلیت کے لحاظ سے حضرت قابلؔ کسی سے کم نہیں تھے

لیجئے انتظام الدین حیرتؔ کے کچھ اشعار مزید سنئے اور لطف اٹھائیے۔

ابر ہے ساقی ہے مے ہے جام ہے　　　کس سے پوشیدہ مرا انجام ہے
ہوش والے ہی تری محفل میں ہیں　　　ایسے ویسوں کا یہاں کیا کام ہے

غیروں سے التفات ہے اور مجھ سے بے رخی　　　تجھ سے تو یہ امید میرے ساقیا نہ تھی

اس نے جلوے کو عام کر ڈالا　　　جو نہ کرنا تھا کام کر ڈالا

اسے جتنا بھی چاہو طول دے دو　　　محبت داستاں ہی داستاں ہے

حسینوں کے جھرمٹ میں گم ہو کے حیرتؔ　　　کھلونوں سے دل اپنا بہلا رہے ہو

دنیا بھری پڑی ہے جلووں سے اس کے حیرتؔ کس کس سے دل بچائیں کس کس سے دل لگائیں

وہ ادھر اپنے کئے پر تھے پیشماں حیرتؔ میں پیشمان ادھر میری خطا ہو جسے

تاثیر دوا میں نہ دعاؤں میں اثر ہے بیمار محبت نہ اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

حیرتؔ کے لئے وطن چھوڑنا زبردست ایثار کا مظہر ہے لیکن یاد وطن پر کون قابو پا سکتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جانا ہو گر ترا ادھر اے باد تند و تیز اجڑے مرے دیار کے آثار دیکھنا

ہزار اس کی فضائیں سہی چمن کی سی دیار غیر میں راحت کہاں وطن کی سی

ایک مدت ہو گئی چھوڑے ہوئے حیرتؔ وطن لیکن ان گلیوں کا اب بھی آنا جانا یاد ہے

الگ تھلگ ہوں ہر ایک انجمن سے اے حیرتؔ وطن میں بھی مری ہستی ہے بے وطن کی سی

جناب و بیگم سید منصور عاقل کی دختر نیک اختر عزیزہ ڈاکٹر سیدہ صباحت منصور کو جو برنسلے ساؤتھ یارکشائر (انگلینڈ) میں اپنے شوہر ڈاکٹر صمد تجمل ہاشمی کے ساتھ مقیم ہیں اللہ تعالیٰ نے دولتِ فرزند سے نوازا ہے۔ بچہ کی ولادت بتاریخ ۱۵ فروری ۲۰۰۴ء بروز اتوار بوقت سات بجکر بیس منٹ علی الصبح (عین طلوع آفتاب کے وقت) ہوئی اور نام دانیال تجمل ہاشمی رکھا گیا اس مبارک موقع پر محترم رفیق عزیزی صاحب نے خوبصورت تاریخ ولادت (عارض انور دانیال) کہی اور ایک تہنیتی نظم کے ساتھ ارسال فرمائی۔ ادارہ الاقرباء جناب رفیق عزیزی کے مندرجہ ذیل خط اور بہترین دعاؤں کے ساتھ یہ نظم نذر قارئین کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے (ادارہ)

عزیز مکرم سید منصور عاقل صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

برخورداری صباحت سلمہا کی گود بھری الحمد للہ۔ جس قدر اس رحمت پر اظہار بندگی کیا جائے کم ہے۔ سارے اعزۃ و اقربا کو مبارک ہو۔ اس مبارک و مسعود موقع پر ایک قطعہ تاریخ میں نے بطور سنّتِ مسبوقین موزوں کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو ہدیہ قارئین الاقرباء ہے۔ والسلام

فقیر سید رفیق عزیزی عفی عنہٗ
کراچی
۱۹ مارچ ۲۰۰۴

بسم اللہ والحمد للہ وصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ

عارضِ انورِ دانیال

۱۰۷۱ + ۲۵۷ + ۹۶

۱۴۲۴ھ

نظم تہنیت

یو، کے میں پھیلی یہ خبر راحت رساں
منصور عاقل ہوگئے نانا میاں

اے برنسلے تیرا نصیبہ جاگ اٹھا
یہ دانیال خوش لقا جو آ گیا

لتاں صباحت ہو گئیں ابا صمد
یہ خوش رہیں تا عمر یا مولیٰ مدد

ہے روزِ خوش، اتوار کہتے ہیں جسے
اتوار کیا انوار کہتے ہیں اسے

تیئیسویں ذی الحج کی ہے یہ بے گماں
یہ سال ہے چودہ سو چوبیں ہم عناں

سن دو ہزار و چار، پندرہ فروری
ہے سات بج کر بیس وقتِ زچگی

یہ شادماں تینوں رہیں ربُّ العُلا
ہے دعا گو یہ رفیق بے نوا

بیگم شہلا حسن زیدی

ایک عظیم فاتح اور سپہ سالار۔ محمود غزنوی

پاکستان کی تاریخ میں جو مقام محمد بن قاسم کا ہے وہی مقام محمود غزنوی کو بھی حاصل ہے۔ محمد بن قاسم نے جس طرح پاکستان کے جنوبی حصوں یعنی سندھ اور بلوچستان کو اسلامی دنیا کا ایک حصہ بنایا بالکل اسی طرح محمود غزنوی نے پاکستان کے شمالی حصوں یعنی صوبہ سرحد اور پنجاب کو اسلامی دنیا کا ایک حصہ بنا دیا اور اس طرح اِس نے محمد بن قاسم کے کام کو مکمل کر کے مستقبل کے پاکستان کی بنیاد رکھ دی۔

محمود غزنوی ترک حکمران سبکتگین کا بیٹا تھا اُس زمانے میں افغانستان میں مغربی ترکستان اور خراسان پر بخارا کے سامان خاندان کی حکومت تھی اور پاکستان میں درہ خیبر سے دریائے ستلج تک ہندو خاندان کی حکومت تھی ملتان اور سندھ میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم تھیں اور ستلج کے پار ہندوستان بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا یہ تمام ریاستیں ہندووں کی تھیں سامانی مسلمان تھے لیکن حکمران خاندان بت پرست ہندو تھا سبکتگین کی سامانیوں اور ہندو حکمرانوں دونوں سے لڑائیاں رہیں۔ ان لڑائیوں میں سبکتگین کامیاب رہا اور اس کی سلطنت کی حدود خراساں سے اٹک تک جو دریائے سندھ کے کنارے ہے پھیل گئیں پشاور مسلمانوں نے پہلی مرتبہ سبکتگین کے زمانے ہی میں فتح کیا اپنے باپ کے انتقال کے بعد جب محمود غزنوی غزنی کے تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر صرف پچیس سال تھی محمود شروع ہی سے ایک بہادر، حوصلہ مند نوجوان تھا باپ کے زمانے میں وہ خراسان کی جنگوں میں اپنی بہادری کے جوہر دکھا چکا تھا اور سامانی حکمران سیف الدولہ کا خطاب حاصل کر چکا تھا کہتے ہیں کہ محمود کے پیدا ہونے سے ایک گھڑی پہلے سبکتگین نے خواب میں دیکھا کہ اس کے آتشدان میں اندر سے ایک درخت نکلا اور اس قدر بلند ہوا کہ ساری دنیا اس کے سایہ میں آ گئی۔ سبکتگین نے محمود کی پیدائش کو اس خواب کی تعبیر سمجھا اور فالِ نیک سمجھ کر اپنے بیٹے کا نام محمود رکھا جس کے معنی ہیں تعریف کیا گیا مورخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ خواب کی تعبیر واقعی صحیح نکلی اور محمود بڑا ہو کر ایک عظیم الشان حکمران بنا اور اس کی سلطنت یہاں تک وسیع ہوئی کہ ایک عالم نے اس کے انصاف کے سایہ میں آرام و راحت حاصل کیا۔

محمود غزنوی نے پینتیس سال حکومت کی اور اس مدت میں اس نے غزنی کی چھوٹی سی حکومت کو ایک عظیم الشان سلطنت میں تبدیل کر دیا جس کی مغربی سرحد وسط ہند کالنجر تک شمالی سرحد خوارزم تک اور جنوبی سرحد صوبہ گجرات کے شہر سومناتھ تک پہنچ گئی محمود نے ترکستان سے ایران تک جو فتوحات کیں وہ ہمارے موضوع سے باہر ہیں ہم یہاں صرف پاکستان اور ہندوستان کی فتوحات کا مختصر تذکرہ کریں گے۔ محمود نے برصغیر پر کل سترہ حملے کئے محمود غزنوی محض عظیم فاتح اور بے مثل سپہ سالار ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک عادل اور قابل حکمران اور علم و ادب کا عظیم سرپرست تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے نوجوانی کے زمانے میں غزنی میں ایک عمدہ باغ لگوایا تھا اور اس میں ایک شاندار عمارت تعمیر کروائی تھی جب یہ باغ اور عمارت مکمل ہو گئے تو اس نے ایک تقریب کی جس میں علاقے کے دوسرے لوگوں کے علاوہ اپنے والد کو بھی مدعو کیا سبکتگین نے جب یہ باغ دیکھا تو کہا کہ اگرچہ یہ باغ اور عمارت ہے خوبصورت ہیں لیکن ایسی چیزیں تمہارے دوسرے ملازم بھی بنا سکتے ہیں۔ بادشاہوں کو چاہیے کہ ایسی عمارتیں تعمیر کریں کہ جس کی مثال نہ مل سکے۔ محمود نے ادب سے پوچھا اباجان وہ کون سی عمارت ہے جس کا آپ ذکر فرمارہے ہیں؟ سبکتگین نے جواب دیا کہ اس عمارت سے مراد اہل علم ہیں اگر تم ان کے دلوں میں محبت کے بیج ڈالو گے تو ان سے ایسے پھل پیدا ہوں گے جن کے چکھنے سے تمہیں دین و دنیا کی سعادت حاصل ہوگی اور تمہارا نام قیامت تک زندہ رہے گا۔ محمود نے باپ کی اس نصیحت کو یاد رکھا اور بادشاہ ہونے کے بعد اس پر عمل کر دکھایا۔ محمود خود بھی ایک عالم فاضل حکمران تھا، علم فقہ میں ایک کتاب کا مصنف تھا۔ شعر و ادب پر اس کی گہری نظر تھی اس نے اپنی دولت کا بڑا حصہ عالموں ادیبوں، شاعروں اور دوسرے اہل کمال کی سرپرستی میں صرف کیا۔ دنیا کی تاریخ میں بہت کم حکمران ہوں گے جن کے دربار میں محمود غزنوی کے دربار کے برابر اہل علم و فضل جمع ہوئے ہوں گے۔

خاص طور پر شاعروں کی جتنی بڑی تعداد غزنی کے دربار سے وابستہ تھی اتنی کسی دوسرے بادشاہ کے دربار میں کبھی جمع نہیں ہوئی دربار محمود کے شاعروں کی تعداد چار سو تھی محمود جو بھی علاقہ فتح کرتا وہاں کے ممتاز اہل علم و کمال لوگوں کو وہاں سے غزنی لے آتا اور ان کو بڑے بڑے انعامات دیتا اور مستقل وظیفے مقرر کر دیتا اس کی اس قدر دانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل علم اور صاحب کمال لوگ ہر طرف سے اس کے دربار میں آنے لگے اور غزنی دنیا کا سب سے بڑا علمی اور ادبی مرکز بن گیا۔

ایک مغربی مورخ نے لکھا ہے کہ نپولین نے اپنے مفتوحہ علاقوں سے آرٹ کے نوادر جمع کر کے پیرس کو آراستہ کیا، لیکن محمود نے اس سے بہتر کام کر دکھایا اس نے خود آرٹسٹوں اور شعراء کو لا کر اپنے دربار کو منور کیا۔

محمود کے دربار میں ہر وقت دینی، ادبی اور علمی موضوعات پر مباحثوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس نے غزنی میں ایک شاندار مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ اور کتب خانہ کی عمارت بھی تعمیر کرائی تاکہ عوام زیادہ سے زیادہ علم حاصل کر سکیں محمود جب تخت پر بیٹھا تو فارسی شاعری اپنے ابتدائی دور سے گزر رہی تھی لیکن محمود کی سرپرستی کی بدولت تیس سال کی مختصر مدت میں فارسی شاعری اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ حدیث اور فقہ میں امام ناصحی اور امام معلوی کی فنِ تاریخ میں بیہقی اور عتبی ادب میں عبدالمالک ثعالبی اور شاعری میں فردوسی عنصری اور فرخی کے نام ممتاز ہیں۔

سلطان غزنوی کا ۲۲ ربیع الثانی ۳۰ اپریل ۴۲۱ھ ۱۰۳۰ء کو انتقال ہوا۔ مؤرخ فرشتہ نے محمود غزنوی کے کارناموں کا تذکرہ نہایت جامع انداز میں کیا ہے' وہ لکھتا ہے کہ تمام مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سلطان محمود دنیاوی اور دینی خوبیوں کا مجموعہ تھا' اپنی دلیری اور شجاعت، عدل و انصاف، انتظام سلطنت اور فتوحات کی بناء پر دنیا کے گوشے گوشے میں مشہور تھا اس کی معرکہ آرائیوں کا اصل سبب یہ تھا کہ اسلام اور انصاف کی برکات کو پھیلایا جائے اور ظلم و تعدی کی بنیادوں کو ڈھایا جائے اس کی بہادری، جرات مندی اور استقلال کا یہ عالم تھا کہ میدان جنگ میں سیلاب کی طرح بڑھتا چلا جاتا تھا اور کسی بلندی اور پستی کا مطلق خیال نہ کرتا تھا انصاف کا یہ عالم تھا کہ دور اور نزدیک ہر جگہ اس کی انصاف پسندی کا بول بالا تھا۔

محمد حبیب اللہ اوج

مومن کے اعزازات

☆ فرشتے روح قبض کرنے سے پہلے ''السلام علیکم'' کہتے ہیں۔ ☆ مومن کی روح قبض کرنے کیلئے سورج کی طرح روشن چہروں والے فرشتے آتے ہیں۔ ☆ مومن کی روح لپیٹنے کیلئے رحمت کے فرشتے جنت سے سفید ریشمی کفن اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ ☆ روح کو معطر کرنے کیلئے، رحمت کے فرشتے جنت سے خوشبو بھی اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ ☆ مومن کی روح قبض کرتے ہوئے فرشتے مومن شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور اسکی خوشنودی کی بشارت دیتے ہیں۔ ☆ مومن کی روح جب اس کی جسم سے نکلتی ہے تو اس سے روئے زمین پر پائی جانے والی بہترین مشک وعنبر جیسی خوشبو آتی ہے۔ ☆ مومن کی روح کیلئے زمین وآسمان کے درمیان موجود تمام فرشتے رحمت کی دعائیں کرتے ہیں۔ ☆ مومن کی روح آسمان پر لے جانے والے فرشتے آسمان کے دروازے پر مومن کا تعارف کرواتے ہیں تو محافظ فرشتے ''خوش آمدید'' کہتے ہوئے آسمان کے دروازے کو کھول دیتے ہیں۔ ☆ ہر آسمان کے فرشتے مومن کی روح کو الوداع کہنے کے لئے اگلے آسمان تک جاتے ہیں۔ ☆ ساتویں آسمان پر پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے مومن روح کا اندراج علیین میں کرلیا جاتا ہے اور روح کو قبر میں بھیج دیا جاتا ہے۔

(سورہ نحل۔ آیت ۳۲۔ سورہ احزاب۔ آیت ۴۴۔ بخاری، مسلم، الترغیب والترتیب مسند احمد۔ مستدرک حاکم ومسند ابن حباں، ابن ماجہ)

☆ قبر میں مومن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام واکرام ذیل سے نوازا جاتا رہے گا۔

(۱) قبر میں اطمینان اور بے خوفی کی کیفیت (۲) جہنم سے نجات کی خوشخبری (۳) جنت کی بشارت اور جنت میں آرام وآسائش سے مزین آرام گاہ اور محلات کا دلکش نظارہ (۴) جنت کی نعمتوں سے مستفید ہونے کیلئے جنت کی طرف ایک دروازہ (۵) جنت کے بستر اور جنت کے لباس (۶) قبر کی فراخی اور کشادگی (تقریباً ۷۰ ضرب ۷۰ یعنی (۳۵x۳۵ میٹر) (۷) قبر میں چودھویں کے چاند جیسی روشنی کے ساتھ اور سبز وشاداب باغ کا منظر (۸) قبر کی تنہائی دور کرنے کیلئے نیک اعمال کی خوبصورت انسانی شکل میں رفاقت (۹) قیامت کے دن ایمان پر اٹھنے کی بشارت (۱۰) روز قیامت تک آرام اور سکون کی نیند

(ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد، ابوداؤد، طبرانی مستدرک، حاکم ابن حباں)

بشکریہ کتاب ''محسنِ کائنات'' ۔ ''اسلام وجدید مسائل'' مولف ومصنف ڈاکٹر ایم محی الدین قاضی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (امریکہ) ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان۔ ۲ ٹمپل روڈ لاہور

تعارف

شہلا احمد

جناب سید محمد حسن زیدی

(نومنتخب رکن مجلس انتظامیہ)

مجلس عمومی الاقرباء فاونڈیشن کے ساتویں سالانہ اجلاس کے موقع پر مجلس انتظامیہ کی ایک خالی نشست کے لئے انتخاب ہوا۔ محترم سید آفتاب احمد نے الیکشن کمشنر کے فرائض انجام دیئے اس نشست کے لئے صرف ایک ہی نامزدگی موصول ہوئی اور وہ نام تھا سید محمد حسن زیدی صاحب کا۔ چنانچہ آپ کو اس نشست پر بلا مقابلہ منتخب قرار دے دیا گیا۔ ذیل میں ہم ان کا مختصر سا تعارف اراکین الاقرباء فاونڈیشن کی معلومات کے لئے پیش کر رہے ہیں۔

جناب سید محمد حسن زیدی ۲۸ مئی ۱۹۴۹ کو علی گڑھ انڈیا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا نام قاری سید مظفر علی زیدی ہے۔ میٹرک تک تعلیم آپ نے علی گڑھ ہی میں حاصل کی۔ اکتوبر ۱۹۶۳ میں پاکستان آگئے اور باقی تعلیمی مراحل یہیں طے کئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اقتصادیات کیا جبکہ لندن سے انتظامی امور و ترقی میں ایم ایس سی کیا اور مرکزی حکومت میں فرائض منصبی سنبھال لئے۔ آج کل جوائنٹ سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہیں اس سے پیشتر آپ اقتصادی تعاون کی تنظیم ECO میں پانچ سال ۹۶۔۱۹۹۱ تہران میں بحیثیت ڈائریکٹر خدمات انجام دیتے رہے۔ اللہ کے بندوں سے محبت اور انسانیت کی خدمت کا جذبہ آپ کو اپنے والد صاحب سے ورثہ میں ملا ہے۔ اپنے والد محترم کے مشن کو حسن زیدی صاحب نے مقصد حیات بنالیا ہے۔ شاعری سے بھی شوق رکھتے ہیں، حسن تخلص ہے، غزلیں اور نعتیں دونوں کہتے ہیں، نعت ترنم سے ایک خاص کیفیت کے ساتھ پڑھتے ہیں، سچے عاشق رسولؐ ہیں۔ نعتوں کا مختصر سا مجموعہ اشاعت کیلئے تیار ہے۔

۲۸ ستمبر ۱۹۸۳ء کو سید حسن صاحب کی شادی کراچی میں سید افضال احمد زیدی کی صاحبزادی سیدہ شہلا انجم زیدی سے ہوئی۔ جنھوں نے ابتدائی تعلیم پاکستان کے مختلف شہروں سے حاصل کی۔ جبکہ گریجویشن کراچی یونیورسٹی سے کیا۔ بی اے کے بعد آپ نے درس و تدریس سے رشتہ جوڑ لیا اور تقریباً سات سال تک اسلام آباد انٹرنیشنل اسکول میں تعلیمی شعبہ سے وابستہ رہیں۔ امور خانہ داری کے علاوہ ادبی، ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں سے بھی دلچسپی رکھتی ہیں۔ آپ کے دو بچے ہیں، بیٹا فائز حسن بارہ سال اور بیٹی سبل حسن نو سال۔ دونوں زیر تعلیم ہیں۔

مرتبہ

بیگم طیبہ آفتاب

گھریلو چٹکلے

☆ سر سے خشکی دور کرنے کیلئے:

سر کی خشکی سے عام طور پر لوگ پریشان رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک مجرب نسخہ:

سرسوں کا تیل　　　کیلے کے تنے کا رس　　　انڈہ اور دہی

ان تمام چیزوں کو باہم ملا کر پیسٹ سا بنالیں اور بالوں پر اچھی طرح لگا کر اسکارف باندھ لیں ایک گھنٹے بعد سر دھولیں انشاءاللہ خشکی دور ہو جائے گی۔

☆ دمہ (Asthma) کے لئے:

آدھا کپ ناریل کا تیل لے کر ہلکا گرم کرلیں اور اس میں ایک چمچ کپور کا تیل ملا کر سینے پر ملیں انشاءاللہ فوراً ہی آرام آجائے گا۔

☆ بدہضمی کا فوری علاج:

بدہضمی کی صورت میں پودینہ کا استعمال نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔ پودینے کے چار پانچ پتوں کو دھو کر ایک گلاس پانی میں ڈال کر دو تین گھنٹے کے لئے رکھ دیں بعد میں پتے نکال کر پی لیں، انشاء اللہ جلد ہی فائدہ ہو جائے گا۔

☆ بالوں کے لئے کنڈیشنر بنانے کی ترکیب:

مہندی کو کیلے کے تنے کے رس میں گھول کر اس میں دودھ اور سرسوں کا تیل ملالیں۔ اب اس مرکب کو باریک کپڑے میں چھان لیں۔ یہ مرکب زیادہ گاڑھا نہیں ہونا چاہیے اس کو بالوں میں اچھی طرح لگالیں اور ڈیڑھ گھنٹے بعد سر دھولیں۔ بال خوبصورت، چمکدار اور نرم ہو جائیں گے۔

☆ لُو سے بچنے یا لُو لگنے کی صورت میں:

اگر لُو لگ جائے تو چھاتی اور کنپٹیوں پر پیاز کے رس کی مالش کریں اور اس کا رس پلائیں بھی فوری فائدہ ہوگا۔ اگر لُو سے بچنا چاہتے ہیں تو گرمیوں میں دن میں کم از کم دو بار پیاز ضرور کھائیں اور گھر سے باہر نکلتے وقت پیاز پاس رکھیں۔ دوسرے پانی پی کر باہر جائیں اسکے علاوہ تلسی کے پتوں کا رس نکال کر اس میں چینی ملا کر پینے سے بھی لُو نہیں لگتی اور چکر بھی نہیں آتے۔ لیموں ایک گلاس پانی میں نچوڑ کر اس

میں حسب ذائقہ مصری ملا کر پینے سے بھی لُو کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

☆ دائمی قبض دور کرنے کے لئے:

دائمی قبض سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک تولہ جو کے پانی میں روغن زیتون ملا کر پی لیں اس کے علاوہ زیتون کے تیل کا استعمال معدہ اور آنتوں کے امراض کے لئے فائدہ مند ہوتا ہے۔

☆ چہرے کی جلد نرم و ملائم رکھنے کیلئے:

اس مقصد کیلئے چکنی مٹی یا ملتانی مٹی میں عرق گلاب ملا کر چہرے پر اس کا ماسک لگالیں۔ جلد نرم اور ملائم ہو جائے گی اس کے علاوہ چہرے پر موجود دانے ختم اور کھلے مسام بند ہو جائیں گے یہاں تک کہ چہرے کے چھوٹے موٹے گڑھے بھی بھر جاتے ہیں۔

☆ تھکاوٹ دور کرنے کیلئے

اگر جسم میں تھکاوٹ اور سستی ہو تو ۵۰ گرام مصری ۲۵ گرام سونف، ۵۰ گرام گری بادام اور ۵۰ گرام جو لے کر انہیں الگ الگ پیس کر باہم ملا لیں اور پھر اس سفوف کو ناشتہ میں ایک چھوٹی چمچی کے برابر استعمال کریں انشاء اللہ آپ خود کو چاق و چوبند اور چست محسوس کریں گے۔

☆ کمر کے درد کے لئے

چندن کا پاؤڈر بنا کر اسے ملتانی مٹی میں ملا کر پیسٹ سا بنا لیں اور کمر کے نچلے حصے میں اس کا لیپ کر کے سوکھنے کا انتظار کریں۔ سوکھنے پر پانی سے دھو لیجئے اس کے بعد سرسوں کے تیل کی اسی جگہ پر ہلکی ہلکی مالش کیجیے۔ انشاء اللہ درد جاتا رہے گا۔

☆ بالوں کو لمبا کرنے کے لئے:

اس مقصد کے لئے آپ کو مندرجہ ذیل اشیاء درکار ہوں گی۔

(۱) کیلے کی جڑ کا رس ایک سیر (۲) چقندر کا رس ایک سیر (۳) مہندی آدھا پاؤ (۴) تل کا تیل چار چھٹانک کیلے کی جڑ کے رس میں چقندر کا رس، آملہ خشک، مہندی کے سوکھے پتے ڈال کر جوش دیں جب سارا رس جل جائے تو تیل ڈال دیں اور جب یہ پک کر یکجان ہو جائے تو نتھار کر بوتل میں ڈال لیں اور بالوں میں لگائیں بال لمبے اور گھنے ہو جائیں گے۔